جدلیاتی اور تاریخی میٹیریلزم

انتساب

سنگت اکیڈمی آف سائنسز
اور
بلوچستان سنڈے پارٹی
کے نام

پیش لفظ

تضاد کا قانون

مخاصمانہ اور غیر مخاصمانہ تضادات

بنیادی اور غیر بنیادی تضادات

اندرونی اور بیرونی تضادات

کوالٹی اور کوانٹی ٹی

کوالٹی

کوانٹی ٹی

نفی کی نفی کا قانون

فارم اور کانٹینٹ

قوم اور قومی سوال

ریاست

علم اور عمل کا نظریہ

حواسِ خمسہ

مغز یا برین

بیرونی دنیا

بنیاد اور بالائی ڈھانچہ

اخلاقیات

سائنس

آرٹ

نظریہ

ہسٹاریکل میٹیریلزم

تاریخ میں فرد کا رول

قدیم کمیونزم

غلام داری سماج

فیوڈلزم

کیپٹل ازم

کماڈٹی

پیسہ آتا کہاں سے ہے؟

اشتہار

اتنا پیسہ کرنا کیا ہے؟

کیپٹلزم کی تباہ کاریاں

معاشی بحران

مالیاتی بحران

ایٹمی جنگ کا خطرہ

بیگانگی

اخلاقی بحران

کلاسز اور کلاس سٹرگل

بنیادی طبقات

غیر بنیادی طبقات

کلاس سٹرگل کی صورتیں

معاشی جدوجہد

نظریاتی جدوجہد

سیاسی جدوجہد

سیاسی پارٹی

پارٹی اخبار

پارٹی کے خلاف سازشیں

کیپٹلزم کا متبادل نظام

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

نرائن چکبست

پیش لفظ

کائنات انسان کے لیے ایک راز رہی ہے۔ اِسے جاننے کے لیے انسان نے جو ذریعہ اپنایا وہ حسی تجربے یا مشاہدے کا تھا۔ یہ زبردست طریقہ تھا۔ یہی طریقہ آگے چل کر سائنس کہلایا۔

انسان میں دو عظیم صلاحیتیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک سائنس ہے دوسری آرٹ ۔سائنس دیگر باتوں کے علاوہ طبعی کائنات کی گہرائیوں کا انکشاف کرتی ہے۔ آرٹ فطرت اور معاشرے میں انسان کی زندگی کے عمومی اصولوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

سائنس وہ دریافت کردہ حتمی سچائی ہے جس کی تشریح کی جاسکتی ہو اور جو ہر جگہ تجربے سے یکساں نتیجہ دے سکے۔ سائنس میں فلسفہ کے ہائپوتھیسز یا تھیوری پر تحقیق کرنے کی صلاحیت تو موجود ہے مگر اسے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی اُس وقت تک صلاحیت موجود نہیں ہے جب تک کہ یہ ''ایسے'' یا ''ویسے'' ثابت نہ ہو جائے۔ لہٰذا ''ثابت شدہ سچائی کو سائنس کہا جاتا ہے''۔

سائنس حقائق کی تلاش میں کبھی اپنے آپ کی بھی نفی کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے، اور کہیں اپنی پچھلی بات کی تصدیق کرتے ہوئے آگے چلتی جاتی ہے۔ سائنس ہمہ وقت

نئے حقائق کھوجتی جاتی ہے اور نئے ادراک کے اعلانات کرتی جاتی ہے۔

سائنس کا کام اپنے دریافت کردہ حقائق کی درجہ بندی کرنا بھی ہے، اُن کی اہمیت کو تسلیم کرانا بھی ہے۔

سائنس مروجہ عقیدوں، روایتوں، پیشن گوئیوں، خوابوں اور بشارتوں پر تحقیق تو خوب کرتی ہے اور انہیں حق یا باطل تو قرار دیتی ہے مگر خود کو اُن کی مطابقت میں ڈھالنے کی کوشش کبھی نہیں کرتی۔ اس کے برعکس یہ عقیدے، روایتیں، پیشن گوئیاں، خواب اور بشارتیں ہیں جو اپنی توضیح و تشریح کے لئے سائنس کے پیچھے بھاگتی رہتی ہیں۔ دنیا بھر کی روایات ہر وقت اِس جستجو میں رہتی ہیں کہ ''دیکھا؟ سائنسی فلاں حالیہ دریافت نے ہماری صدیوں پرانی فلاں روایت کو برحق ثابت کر دیا ہے''۔ سائنس ایسا نہیں کرتی۔

دانائی، حکمت اور جاننے پہ عاشق ہونے کے عمل کو ''فلسفہ'' کہتے ہیں۔ یہ وجود اور زندگانی کے قوانین کی سائنس کا علم ہے۔ اور یہی تمام علوم کی ماسٹر یونیورسٹی ہے۔

آج کی ترقی یافتہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کی الگ سائنس اور الگ سپیشلٹی ہوتی ہے۔ ہماری ڈاکٹری کے متعلق تو مزاح بھرا فقرہ موجود ہے کہ ایک وقت آئے گا جب دائیں آنکھ کا سپیشلسٹ الگ ہوگا اور بائیں کا الگ۔ دائیں گھٹنے کا ماہر الگ ہوگا اور بائیں کا الگ۔ اِن ساری سپیشلٹیوں کے بنیادی عمومی قوانین میں ہم آہنگی پیدا کرنے والے علم کو ''فلسفہ'' کہتے ہیں۔ فلسفہ سارے علوم (سائنسز) کے قوانین کے ہار کو اکٹھا رکھنے والا دھاگہ ہے۔

بلاشبہ، سیاست بھی بے شمار سائنسوں کو ملا کر چلتی ہے۔ مگر فلسفہ سیاست سے بھی زیادہ علوم کا مجموعہ ہوتا ہے۔ موٹی موٹی بات کی جائے تو سیاست فلسفہ کے بغیر دُم بھی نہیں ہلا سکتی ہے۔ اِن دونوں کو جدا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ فلسفہ کو کسی بھی علم و سائنس سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ چلیں ہم فقرہ کو یوں پیش کرتے ہیں: سائنس فلسفہ نہیں ہوتی۔ مگر فلسفہ سائنس ہوتا ہے۔

مَیٹر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ میٹر، میٹر کی حرکت، اور پراسیس تینوں قابل مشاہدہ ہیں۔ مَیٹر ابھی جتنا سمجھا گیا ہے، اُس سے کئی گنا اب تک ہماری لاعلمی میں پڑا ہے۔

یہ حتمی بات ہے کہ پوری کائنات کچھ بنیادی سائنسی قوانین پر چل رہی ہے۔ یہ قوانین سائنسز کی ماں یعنی فزکس، فزکس کی بہن یعنی میتھ میٹکس، اور کمیسٹری کے ہیں۔ اور یہ قوانین عالمگیر ہوتے ہیں۔ ان قوانین کا ایشیا، افریقہ الغرض پوری دنیا پہ اطلاق ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ قوانین کسی ایک زبان، علاقے کے نہیں ہوتے، کسی ایک نسل کے بھی نہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ یہ ہندو فزکس ہے، یہ یہودی فزکس ہے۔ نہ ہی دوکا پہاڑ مکران میں الگ ہوتا ہے اور موزمبیق کے لیے الگ۔ اسی طرح دولت ذاتی ہوسکتی ہے، اعتقاد ذاتی ہوسکتی ہے، پسند ناپسند ذاتی ہوسکتی ہے۔ مگر دنیا بھر میں ایسا نہیں ہوسکتا کہ سائنس کسی کی ذاتی ملکیت ہو۔

المختصر کائنات پہ لاگو قوانین صرف زمین اور مریخ کے بھی نہیں ہوتے۔ یہ سارے سیاروں پہ یکساں لاگو ہوتے ہیں۔ کُل کائنات کے قوانین۔

کائنات کے قوانین دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں جس کا علم حاصل نہ کیا جا سکے، جس کی تشریح نہ کی جا سکے۔ اب تو سائنس اس قدر طاقتور ہوگئی کہ سب کو یہ بات منوا گئی۔ مگر ماضی میں ایک بڑا کشمکش بھرا اور متشدد طویل زمانہ گزرا جب انسان اس بات پہ ایک دوسرے کا سر توڑتا رہا ہے۔

قانون ہے کہ ہر میٹیریل چیز دوسرے سے جڑی ہوئی بھی ہوتی ہے اور ایک دوسرے پر منحصر بھی۔

کوئی مظہر ''ابدی'' نہیں ہوتا، حتمی نہیں ہوتا۔ ابدی، حتمی اور ثبات والی چیز تو ''ہمہ وقت تبدیلی'' ہے، بس۔

آپ کسی مَیٹیریل چیز کو اُس کے آس پاس سے کاٹ کر دیکھ ہی نہیں سکتے، جان ہی نہیں

سکتے۔ یعنی کائنات دراصل اشیا، مظاہر اور پراسیسوں کا ایک مربوط مجموعہ ہے۔ اس کے اندر موجودات ایک دوسرے سے متعلق اور منسلک ہیں۔ ایک دوسرے پر اثر بھی ڈالتے ہیں، ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے کی حد بندی بھی کرتے ہیں۔ اس لیے نیچر میں موجود کسی بھی چیز کی ذاتی حیثیت بھی اہم ہوتی ہے مگر اُسے اس کے ماحول، اُس کے آس پاس سے کاٹ کر نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

فلسفہ کی دنیا میں ہمیشہ سے ایک ایسا بنیادی اور عالمگیر سوال موجود رہا ہے جس پہ انسان صدیوں سے غور و فکر، بحث مباحثے، نوک جھونک، جھگڑے پھڈے کرتا رہا ہے۔۔۔ حتی کہ ایک آدھ قتل سے لے کر لاکھوں کروڑوں انسانوں کے قتل ہوجانے تک کے مناقشے رہے ہیں۔ اسے فلسفے کا ''بنیادی سوال'' کہتے ہیں۔

لوگ اکثر کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ دنیا میٹیریل دنیا ہے۔ بالکل یہاں موجود ہر چیز مَیٹر ہے اور مَیٹیریل چیز سے نکلی ہوئی ہر چیز میٹریل ہے۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ اس میٹریل دنیا کا بنیادی عنصر یعنی میٹر (matter) کب پیدا ہوا؟۔ اس کے پیدا ہونے سے پہلے کیا کچھ تھا؟۔ پھر یہ بھی کہ کیا مَیٹر کو فنا ہے؟۔ اور اگر ہے تو اس کے فنا ہونے کے بعد کیا ہوگا؟۔

بوڑھا فلسفہ ہزاروں برس تک اس گتھی کو سلجھانے میں مغز کھپاتا رہا۔ یہ مٹی کا ایسا گھوڑا تھا کہ پاکستانی انقلاب کی طرح پاؤں پر کھڑا کرو بھی گر جاتا ہے، سر کے بل کھڑا کرنا چاہو تو بھی گر جائے۔ کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔

تب فلسفہ کا فزکس نامی ہونہار بیٹا باپ کی مدد کو آیا۔ فزکس نے ثابت کر دیا کہ میٹر وہ ہے جو جگہ گھیرتا ہو، جس کا وزن ہو اور جو پانچوں حسوں میں سے کسی ایک کے ذریعے محسوس کیا جا سکتا ہو۔۔۔ یعنی مَیٹر ہمارے حواس سے آزاد اپنا وجود رکھتا ہے۔

اِدھر تک تو خیر تھی۔ ستے خیراں والی بات فزکس کی یہ ہے کہ اس نے یہ ثابت کیا کہ مَیٹر

ازلی بھی ہے ابدی بھی۔ یہ مستقل طور پر موجود رہا ہے۔ لہذا اس کا ڈیٹ آف برتھ موجود ہی نہیں ہے۔ یعنی میٹر کے بارے میں ''اولین بات''، ''اولین واقعہ''، ''شروعات'' والے لفظ وتصورات موجود ہی نہیں ہیں۔

اسی طرح فزکس نے یہ بھی ثابت کیا کہ مَیٹر کا کوئی ایکسپائری ڈیٹ بھی نہیں ہوتا۔ یعنی میٹر کے لیے فنا کا لفظ اور تصور موجود نہیں ہے۔ اب جب بھی بلوچ کہتا ہے کہ دنیا فانی ہے یا دنیا چار دن کا کھیل ہے تو وہ اصل میں دنیا یا مَیٹر کی بات نہیں کر رہا ہوتا ہے، وہ تو اپنی زندگی کے بارے میں بول رہا ہوتا ہے۔ ''افسوس ہم نہ ہوں گے'' والا معاملہ ہے ورنہ یہ زندگی کے میلے دنیا میں کبھی کم نہ ہوں گے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ میٹر اور اُس سے بنی کائنات کسی روح کا سایہ نہیں ہے۔ اگر ''سایہ'' کی تشبیہ کو قائم ہی رکھا جائے تو بقول فہمیدہ ریاض دراصل یہ حقیر وفقیر میٹر ہی ہے جس کا سایہ خیال، تصور، روح وغیرہ ہیں۔ یہ اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔

میٹر ختم نہیں ہوسکتا، بس یہ اپنی شکل بدلتا رہتا ہے، اس کے اجزا اِدھر اُدھر منتشر ہو جاتے ہیں، اپنے اجزا میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور پھر کہیں مرتب ہوتے ہیں۔

ہم مٹی ہیں، مر کر ہم مٹی، یعنی قبر کی مٹی سے مل جائیں گے اور انجام یہ کہ بالآخر مٹی۔ مگر ہم سے مل کر یہ مٹی پھر درخت پودا وغیرہ بنے گی جسے پھر مر کر مٹی بننا ہے۔ شکلیں بدلتے رہنا۔ کوئٹہ کے سریاب روڈ پہ واقع جی ایس پی (جیالوجیکل سروے آف پاکستان) کے میوزیم میں ایک ہال کے اندر بڑے بڑے پتھر ترتیب سے فرش پر رکھے ہوئے ہیں۔ مگر گائیڈ کو جب اندازہ ہو کہ آپ انہیں معمولی پتھر سمجھ رہے ہیں تو وہ فوراً کہہ اٹھے گا۔ ''صاحب یہ ڈیرہ بگٹی کے علاقے میں تین کروڑ سال قبل کے 20 میٹرک ٹن وزن والے بڑے جانور ''بلوچی تھیریم'' کی ہڈیاں ہیں جو پتھر یا فوسلز میں تبدیل ہو چکی ہیں''۔ ارے؟ اس کا کیا مطلب ہے؟۔ جسم پتھر میں بدل گیا؟۔۔ اچھا اچھا، یعنی میٹر اپنی شکلیں سالڈ (ٹھوس)، لیکوئڈ (مائع)، پلازما، اور،

گیس کی صورتوں میں بدلتا رہتا ہے۔

اُنیسویں صدی کی ایک دوسری دریافت ''توانائی کا ایک دوسرے میں بدلنے'' کا انکشاف ہے، جو 1847 میں رابرٹ میئر نے کیا۔ پرانے زمانے میں خیال تھا کہ آواز، حرارت اور روشنی مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ مگر اُنیسویں صدی کی رابرٹ میئر کی اِس دریافت سے پتہ چلا کہ یہ سارے مظاہر مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے میں بدل بھی سکتے ہیں۔

اندازہ ہوا کہ بلوچی تھیریم مر کر فنا نہیں ہوتا بلکہ اُس کے اندر موجود کیمیائی عناصر دوسری صورتیں اختیار کرتے ہوئے اس دنیا میں موجود رہتے ہیں۔ عناصر کا مسلسل ظہور وترتیب، اور عناصر کا ہمہ وقت پریشان رہنا۔ میٹر اپنے عناصر کے اسی ترتیب و پریشانی کے اَمر سلسلے میں رہتا ہے۔ اسے کوئی فنا نہیں ہے۔ ع:

بگڑے گی اور بنے گی، دنیا یہیں رہے گی

سائنس ڈنڈے ماری کی اُلٹ چیز ہے۔ اس میں سندھی زبان کے فقرے ''رکھ مرشدءَ تے'' کا اطلاق نہیں ہوتا۔ سائنس اِس بات کو بھی نہیں مانتی کہ کائنات یا اُس کے مظاہر جامد وساکت حالت میں رہتے ہیں۔ سائنس صرف حرکت کو مانتی ہے، تغیر پذیری کو مانتی ہے۔ اور سائنس اشیا کا مطالعہ بھی اُن کی حرکت میں ہی کرتی ہے۔۔۔ ''میٹر اِن موشن''۔ یہ حرکت دائمی ہے۔ کبھی نہیں رکتی۔ اور اگر کہیں سکون نظر آ بھی جائے تو جان جائیے کہ یہ اوپر کا سکون ہے، سطح کا سکون۔

حرکت ہی کے سبب تبدیلی، تجدید اور ترقی ممکن ہے۔ نیچر میں کبھی سکوت، جمود اور ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔ یہ مسلسل حرکت اور تبدیلی کے اسی عمل میں پرانا تباہ ہوتا جاتا ہے اور کچھ نہ کچھ نیا پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہ مسلسل ابدی تبدیلی کا عمل ہے۔ گل خان نصیر کے بقول ''ہستی میں تغیر لازم ہے۔۔۔''۔ حرکت ہی کے طفیل چیزیں پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، گھٹتی ہیں اور فنا ہوتی ہیں۔

مطلب یہ کہ کائنات صرف حرکت میں وجود رکھتی ہے۔ میٹر متحرک رہتا ہے۔ ثبات اک تغیر کو ہے، بس۔ دوسرے لفظوں میں مَیٹر اور حرکت لازم وملزوم ہیں۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ حرکت کے لیے جگہ یعنی سپیس ضروری ہوتی ہے اور وہ ٹائم کے اندر ہوتی ہے۔

سائنس میٹر کو نہ صرف ایٹم تک جان چکی ہے۔ بلکہ وہاں سے بھی آگے پروٹان اور بے آرام ومتحرک الیکٹرون تک اس نے دریافت کر لیے ہیں۔

چنانچہ سماج میں کوئی کام، جی ہاں انقلاب سمیت کوئی کام اچانک، اتفاقیہ یا حادثاتاً نہیں ہوتا۔ ہر بات کے پیچھے سبب موجود ہوتے ہیں۔ کبھی ظاہر اور کبھی پوشیدہ۔ ایسے ''سبب'' جو میٹیریل ہوں اور جن کی تشریح ہوسکتی ہو۔

اسی طرح سائنس میں کوئی ''اچانک'' کود جانے والا فلمی ہیرو نہیں ہوتا۔ کہ وہ آجائے اور ساری مشکل حل کردے۔ سائنس ہیرو کو نہیں مانتی، ہیرو گیری کو نہیں مانتی اور ہیرو پرستی کو نہیں مانتی۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سائنس نتائج نہیں طریقۂ کار دیکھتی ہے، (میتھڈالوجی، ناٹ رزلٹ)۔

ہم انسانوں کی طرح، ساری نیچر بھی تباہ ہوتی ہوئی چیز کا ساتھ نہیں دیتی بلکہ اُس چیز کو اہمیت دیتی ہے جو پیدا ہورہی ہے۔

میٹر احساسات سے عاری ہوتا ہے۔ اُس کے کوئی عزیز رشتے دار، گرائیں، ہم وطن، اور ہم قوم نہیں ہوتے۔ وہ خوشی، غم، خوف، طمع، تعریف، اور تنقید سے مبرا ہے۔ نہ اُس کا کوئی دوست ہے نہ دشمن۔ اُسے نہ درد ہوتا ہے نہ پرواہ۔ نہ وہ کسی چیز پہ رحم کھاتا ہے، نہ کسی کو مقدس و سپریم مانتا ہے۔

میٹر کسی اجازت اور خوشنودی کو نہیں جانتا۔ یہ کسی کی خواہشات کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ یہ

نہیں دیکھتا کہ کوئی اُس کے قوانین کو پسند یا ناپسند کرتا ہے۔ آپ خواہ چون وچرا کریں یا نہ کریں۔ مسکرائیں یا غصے سے لال پیلے ہوں مگر اُس کے قوانین کو تسلیم کرنا ہوگا۔ نہ صرف قوانین کو بلکہ اُن سے برامد شدہ نتائج کو بھی۔

چنانچہ آزادی، فطرت اور سماجی قوانین سے آزاد ہونا نہیں ہے۔ بلکہ آزادی یہ ہے کہ آپ اِن قوانین کے علم سے کتنی زیادہ واقفیت رکھتے ہیں، اور اُن کی مطابقت میں عمل کرنے کی کتنی اہلیت رکھتے ہیں۔ ایک ایسی اہلیت جو بالکل اُسی علم سے ابھرے۔ جو کچھ فطری قوانین پر لاگو ہوتا ہے وہی سماجی ارتقا کے قوانین پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ انسان اُس وقت آزاد ہوتا ہے جب وہ انہیں جان لے اور انہیں ایک منصوبہ بند، سائنسی انداز میں استعمال کرسکے۔ وہ نیچر اور سماج کے قوانین سے دور ہوکر آزاد نہیں ہوسکتا۔

کائنات کو جاننے کے لیے سائنس آپ کو دو ضروری باتیں بتاتی ہے:

1۔ آپ کی بنیادیں میٹیریل ہوں۔ جاننے کے اِس طریقے کو ''میٹریلزم'' کہتے ہیں۔ یہ ''اِزم'' گریک زبان سے قرض لی گئی وہ دُم ہے جو کسی تھیوری، ڈاکٹرائن یا کاز والے لفظ کے پیچھے لگائی جاتی ہے۔ مثلاً کیپٹلزم، بدھ ازم، سیکسزم، کیوب ازم اور ریس ازم وغیرہ۔ میٹریلزم کا مطلب ہوا میٹریل دنیا سے متعلق۔ وہ چیزیں جنہیں واضح طور پر ثابت کیا جاسکے کہ وہ میٹر میں وجود رکھتے ہیں۔

2۔ کائناتی قوانین کا علم ''کیا، کیوں، کیسے اور کب'' جیسے سوالات کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ بحث مباحثے کے بغیر علم نہیں ملتا۔ سوال جواب کے مباحثے کے ذریعے حقائق تک پہنچنے کے طریقے کو جدلیات یا ''ڈائلیکٹکس'' کہتے ہیں۔ ڈائلیکٹکس نیچر، انسانی سماج، فکر کی حرکت اور ترقی کے عمومی اصولوں کی سائنس ہے۔

مندرجہ بالا دونوں لوازمات کو ملا کر اس سائنس کو جدلیاتی میٹیریلزم یا ''ڈائلیٹکل میٹیریلزم'' کہیں گے۔

یعنی فطرت کے مظاہر کو سمجھنے کے لیے ڈائلیکٹکل طریقہ اختیار کیا جائے، اور اِن مظاہر کی تعبیر یا تصور میٹیریل ہو۔

مباحثہ کا ایسا طریقِ کار جس میں موضوع کے حق میں اور اس کے خلاف پیش کیے گئے دلائل میں موجود تضاد کی نشاندہی کی جاتی ہے اور اس کی روشنی میں کسی نتیجے پر پہنچا جاتا ہے ۔اس سے ایک اور بات بھی نکلتی ہے۔ خیال صرف لفظ کے میٹریل پیکر میں ہی وجود رکھتا ہے۔ انسان خود سوچے، یا اپنے خیالات کا بلند آواز سے اظہار کرے، یا انہیں تحریر میں لائے، خیال ہمیشہ الفاظ کے پیکر میں ہی ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو گویائی اور تحریری زبان کے بغیر نسل ہا نسل کا بیش قیمت تجربہ رائیگاں چلا جاتا اور ہر نسل مجبور ہوتی کہ دنیا کے مطالعے کے مشکل سلسلہ عمل کو نئے سرے سے شروع کرے۔

تضاد کا قانون

فزکس کی دریافتوں کا ایک اہم ستون یہ ہے کہ ایٹم کو تباہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایٹم لازوال ہے۔ البتہ ایٹم سمیت مَیٹر کی ساری قسمیں تبدیلی کے لیے بے قرار، راغب اور بے چین رہتی ہیں۔

اشیا حرکتی دنیا میں ایک سپیس یا جگہ میں وجود رکھتی ہیں۔ ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے، ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہوئے۔ اسی طرح ہر شئے ایک خاص حالت میں ایک ٹائم کی حامل ہوتی ہے۔ چیز (میٹر نہیں) کا ایک آغاز ہوتا ہے اور ایک انجام۔ اور آغاز و انجام کے درمیانی وقفے میں وہ مختلف مراحل اور حالتوں سے گزرتی ہے۔ یعنی اشیا ٹائم سے جڑے ہوئے ایک سپیس وجگہ میں ہی حرکت کرتی ہیں۔

ہر چیز کے اندر اُس کا الٹ بھی موجود ہوتا ہے۔ اور اس طرح کی جذب شدہ صورت میں موجود ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ہر ایک سالم چیز کے اندر متضادوں کی موجودگی ہوتی ہے۔ چنانچہ دنیا میں کوئی چیز یا مظہر ایسا نہیں جسے اضداد میں تقسیم نہ کیا جاسکے۔ ان مخالف ومتضاد قوتوں کے درمیان باہمی سٹرگل اور جنگ لازمی رہتی ہے۔ یعنی اضداد اُسی چیز یا مظہر میں رہتے ہوئے باہم دست وگریباں رہتے ہیں۔ اس ہاتھاپائی کے بغیر اُس چیز یا مظہر میں کوئی نشوونما اور حرکت ممکن ہی نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ چیز کی شکل وصورت کے اندر موجود تضادات میں جنگ جاری رہتی ہے۔ امن حرام ہے، سکون وسکوت ناممکن ہے۔ ہر چیز میں ایک متحرک وسرگرم جنگ جاری وساری رہتی ہے۔ ان کے بیچ مفاہمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اِن کی علیحدگی اور مخالفت صرف باہمی تعلق اور اتحاد کے باعث وجود رکھتی ہے۔ ان کا اتحاد صرف اُن کی علیحدگی میں وجود رکھتا ہے اور ان کا باہمی تعلق آپس کی مخالفت میں۔ دونوں قطبین کے باہمی جذب یا قطعی علیحدگی کا ناممکن ہوتا ہے۔

سماج کے اندر دو متضاد قوتیں موجود ہیں: جائیداد والا اور بے جائیداد۔ جائیداد والا

بھاری ہے مگر بظاہر، کمزور بے جائیداد طبقہ اُس کے ساتھ ٹکراؤ کو کبھی ترک نہیں کرتا۔

متضادوں کا یہی ٹکراؤ ترقی اور تبدیلی کا ضامن ہوتا ہے اور اسی تضاد کے ٹکراؤ سے کوانٹٹی اور کوالٹی والی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

تضاد کا قانون دنیا کے اصل کو سمجھنے کی کنجی ہے۔ اسی طریقے کو ساری چیزوں کی نشوونما کے مطالعے پہ استعمال کرنا لازم ہے۔ اس طریقے کو سیکھ کر ہی ممالک کی تاریخ، حال اور مستقبل کے بارے میں درست تجزیہ کیا جاسکے گا۔

عمومی طور پر داخلی تضادات ہی سے درخت یا جانور بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ اسی طرح سماجی ترقی بھی خصوصی طور پر اندرونی تضادات ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ روس بادشاہت سے سوشلزم میں داخل ہوا تو وہاں بیرونی اثرات بہت کم تھے، مثلاً آس پاس کوئی بڑی جغرافیائی تبدیلی، کوئی بڑی ماحولیات تبدیلی نہ آئی تھی۔ نہ ہی کوئی دوسری بہت بڑی بیرونی تبدیلی نے روس کے اندرونی حالات کا رخ موڑ دیا۔ داخلی تضادات نے ہی یہ کام کیا، کلاس تضادات نے۔ ہاں، اس پراسیس کو پہلی عالمی جنگ نے ضرور سبک رفتاری عطا کی تھی۔

انڈے کے اندر تضادات موجود ہوتے ہیں تو ایک خاص ٹمپریچر اور نمی دینے سے چوزہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر کسی پتھر کو جتنا چاہے باہر سے ٹمپریچر اور نمی دے دو چوزہ پیدا نہیں کرسکے گا۔

اب یہ نہ سمجھا جائے کہ تضادات کے سبب پیدا شدہ حرکت اور تبدیلی دریائے سندھ کی ڈولفن مچھلی کی طرح اندھی ہوتی ہے۔ نہیں۔ اس کی سمت ہوتی ہے۔ یک طرفہ سمت: جدید کی طرف۔ یہ قدیم سے جدید کی طرف تبدیل ہونے کو مچلتی ہے۔ اور یہ ایسے تبدیل نہیں ہوتی کہ پاکستانی فیوڈل حکمرانی کی طرح ایک دو نمائشی اصلاحات کر کے لیپاپوتی کرلی جائے۔ نہیں۔ میٹر کی ایک صورت سے دوسری میں تبدیلی ایسی ہوتی ہے کہ ساری کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔ ایک جدید صورت کی فتح لازمی ہے۔ اسے ٹوکا تو بہت جاتا ہے مگر اسے روکا

نہیں جا سکتا۔

کمال بات یہ ہے کہ بے چین مَیٹر قدیم کو جدید میں بدل کر آرام نہیں کرتا۔ بلکہ اب وہ پھر اسی ''جدید'' کو قدیم کرنے لگ جاتا ہے اور مزید جدید کی طرف بدل جاتا ہے ۔۔۔۔سلسلہ کبھی نہیں رکتا۔

اس کا ایک اور مطلب بھی ہے: دنیا کا، اشیا کا، اور واقعات کا سب سے بڑا اور بنیادی قانون ''ارتقا'' ہے۔ ارتقا ''خیر'' کا ''شر'' پر بھاری ہونا ہے۔ باہم لڑتے ہوئے ارتقا میں خیر اور شر دونوں موجود ہوتے ہیں، مثبت اور منفی دونوں، ماضی اور مستقبل دونوں، قدیم اور جدید دونوں۔

مطلب یہ ہوا کہ کائنات میں کوئی شئے ایسی نہیں ہے جس کے اندر تضاد موجود نہ ہوں۔ مطلب یہ بھی ہوا کہ تضاد نہ ہو تو کسی شئے کا وجود بھی نہ ہو۔

اُسی تضاد سے ''اجتماعِ ضدین'' کا قانون نکلا۔ مثال کے طور پر ''ایک'' چوبیس گھنٹے میں دو ضدیں ہوتی ہیں: دن اور رات ۔ایک انسان میں مرد اور عورت دونوں کے کروموسومز موجود ہوتے ہیں۔ ''ایک'' مقناطیس میں دو پول ہوتے ہیں: شمالی اور جنوبی۔ دونوں اکٹھے رہتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے ضروری ہوتے ہیں، مگر یہ تو باہم متضاد قوتیں ہیں۔ ''ایک ''ایٹم کے اندر اس کے مرکزہ میں پازیٹو چارج ہوتا ہے اور اسی میں اس کے گرد بیرونی جگہ پر نیگیٹو چارج والے الیکٹرون رقصاں رہتے ہیں۔ ''ایک'' جنگ میں حملہ اور دفاع، پیش قدمی و پسپائی، فتح و شکست دونوں موجود ہوتے ہیں۔ میتھ میں پلس اور مائنس، مکینکس میں عمل اور ردعمل، ۔۔۔ پھر نیک اور بد، دروغ اور راست، زند اور مرگ، رژن و تاریکی، کیپٹلسٹ اور پرولتاریہ، اوپر نیچے، خیر اور شر، دایاں بایاں، موت او حیات، سبب اور نتیجہ، زوال و کمال، لاغر اور پہلوان، اٹریکشن اور ریپلشن، شمال اور جنوب، نر اور مادہ، طاق اور جفت، آسائش اور مشکل۔۔۔

اگر عہد فیوڈلزم کا ہے تو کسان کے بغیر جاگیردار کا وجود نہیں اور جاگیردار کے بغیر کسان نہیں۔ اگر کیپٹلزم ہے تو بورژوازی کے بغیر پرولتاری نہ ہوگا اور پرولتاریہ کے بغیر بورژوا کا وجود نہیں۔ اسی طرح سماج اگر غلام داری ہے تو اس کی متضاد قوتیں آقا اور غلام ہیں۔

یہ متضاد قوتیں باہم دست و گریباں ہیں، مگر رہتے اکھٹے ہیں۔

ایک ہی جسم میں دو متضاد قوتیں۔ مگر یہ لڑتے ہوئے بھی متحد رہتی ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرا وجود نہیں رکھ سکتا۔ دونوں ایک ہی وجود میں بہ یک وقت متصادم بھی ہیں اور ایک دوسرے کے محتاج بھی۔۔۔۔اسے ''اجتماعِ ضدین'' کہتے ہیں۔

صرف اجتماع ضدین ہوتا تو کوئی خاص فرق نہ پڑتا یہاں تو اس اجتماع ضدین کے بیچ زبردست کشمکش بھی ہو رہی ہوتی ہے۔ کُشتی، جھگڑا، جنگ۔ یہ ''رندولاشار'' آپس میں بھائی بھی ہیں مگر ایک دوسرے کی بیخ اکھاڑنے میں بھی لگے رہتے ہیں۔ مگر یہ بیخ مکمل طور پر اکھڑتی کبھی بھی نہیں۔

یہ ضدین قانون کی عین مطابقت میں اکھٹے بھی رہتے ہیں اور برسرِ پیکار بھی رہتے ہیں۔ یہ قانون بڑی سے بڑی حقیقت سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ''ایٹم'' تک پہ لاگو ہوتا ہے۔ اور یہ لڑائی، یہ تضاد جس دن ختم ہوئی زندگی ختم ہو جائے گی۔ دلچسپ ہے کہ ان میں سے ایک کی مکمل فتح دوسرے کی مکمل شکست کبھی نہیں ہوتی۔۔۔ انہی مخالف تضادات کی کشمکش نے زندگی کے تخت کو اپنے کندھوں پہ اٹھائے زندہ رکھا ہوا ہے۔

ایک انفرادی زندگی اپنی حرکت میں موت تک پہنچ کر بظاہر معدوم ہو جاتی ہے۔ مگر یہ موت خود زمین میں دھنس کر نئی زندگیوں کو جنم دیتی ہے۔ اُسی شکل میں نہیں مگر پریشاں عناصر کی ترتیب سے دوسری زندگی پیدا کرتی ہے۔

یہ کشمکش زندگانی، حیاتی اور دنیا کے ضامن ہوتے ہیں۔ ہمہ وقت ہلچل، ہر لحہ تخلیقیت سے چھلکتے ہوئے۔ ہماری ساری ترقی، سارا ارتقا اس برسرِ پیکار اضداد کے اتحاد میں ہے۔

کبھی کبھی اِن جنگی فریقین کی طاقتوں میں توازن آجاتا ہے اور کوئی ارتقا وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ایک طرح کا توازن اور تعطل۔ ہم اس کے لیے ایک حتمی لفظ استعمال کرتے ہیں ''عارضی''۔ یہ خواہ ایک سیکنڈ کا ہو یا ایک صدی کا۔مگر ہوتا عارضی ہے۔لڑائی تو ہونی ہے۔

ہاں کبھی کبھی سماج ہمارے پاکستانی 70 سال کی طرح dull، بور، ساکت اور بے ذائقہ ہوجاتا ہے۔ یہ عارضی (خواہ سینکڑوں سال کیوں نہ ہوں) صورت تب پیدا ہوتی ہے جب تضادات میں توازن پیدا ہوجاتا ہے۔

مطلب کہنے کا یہ ہے کہ آپ نے جس بھی چیز کو سمجھنا ہو، یا کسی مظہر کو جاننا ہو، یا پھر کوئی فکر معلوم کرنی ہو تو اس کے بیچ تضاد کو تلاش کیجیے، اس تضاد کی نوعیت معلوم کیجیے اور وہاں تضادات کی کشمکش کو جانچیے۔

ہر طرح کا سماج اور ہر طرح کا نظریہ اپنے اپنے تضادات رکھتے ہیں۔ پراسیس تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔ پرانے پراسیس اور پرانے تضادات غائب ہوجاتے ہیں۔ نئے پراسیس اور نئے متضاد ابھرتے رہتے ہیں اور اسی کی مطابقت میں تضادات کو حل کرنے کے طریقے بدلتے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے میں اور آپ ہمیشہ جدید کا ساتھ دیں گے، ترقی پذیر کا ساتھ دیں گے۔ ہم اس جدید اور ترقی پذیر کا ساتھ دو طرح سے دیں گے:

1۔نشوونما کے راستے میں رکاوٹیں دور کرکے۔

2۔اس ترقی یا نشوونما کے عمل کو تیز کرکے۔

تضاد کی قسمیں

1۔مخاصمانہ اور غیر مخاصمانہ تضادات

مخاصمانہ تضادات وہ ہوتے ہیں جو صرف انسانی ''سماج'' میں پائے جاتے ہیں۔اور یہ تضادات معاشی مخالف طبقات کے درمیان ہوتے ہیں۔ان میں مصالحت، give and take، اور میڑھ مرکہ ناممکن ہوتا ہے۔ راضی نامہ اور مفاہمت خارج از امکان، اور اصلاح وریفارم بعید از قیاس۔ یہ ایسے بنیادی اور فیصلہ کن تضاد ہوتے ہیں جو موجود سماجی ڈھانچے کے اندر حل نہیں ہوسکتے۔ایسی شدید لڑائی کہ یہ صرف جنگ (سماجی انقلاب) سے حل ہوسکتے ہیں۔آج کی صورت حال میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے بیچ تضاد مخاصمانہ (معاندانہ) تضاد ہے۔

غیر مخاصمانہ تضادات مخالف طبقات کے درمیان موجود نہیں ہوتے۔ وہ ایسے تضادات ہوتے ہیں جو ایک ہی طبقے کے اپنے اندر موجود معمولی تضادات ہوتے ہیں۔ یعنی مزدوروں اور کسانوں کے بیچ تضاد، مزدوروں کے اپنے اندر باہمی تضاد۔ شہروں اور دیہاتوں میں تضاد۔

ان تضادات کو حل کرنے کے لیے نہ جنگ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ انقلاب کی۔

2۔بنیادی اور غیر بنیادی تضادات

بنیادی تضادات وہ ہوتے ہیں جو ترقی اور تبدیلی کے عمل میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ان کے حل ہونے سے دوسرے تمام تضادات خود بخود حل ہوجاتے ہیں۔ بنیادی تضاد کی موجودگی اور نشوونما دوسرے تضادات کی موجودگی اور نشوونما کو متعین یا متاثر کرتا ہے۔

پرولتاریہ اور بورژوازی آج بنیادی تضاد ہیں۔اور دوسرے تضادات مثلاً فیوڈلزم کی باقیات کے طبقے اور بورژوازی کے بیچ ، یا کسان اور پیٹی بورژوازی کے درمیان ، بورژوا ڈیموکریسی اور بورژوا فاشزم کے درمیان سب کے سب بنیادی تضاد سے متعین یا متاثر ہوتے ہیں۔

بنیادی تضاد فیصلہ کن اور رہنمایانہ رول ادا کرتا ہے۔اور بقیہ ثانوی اور ماتحت پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ایک بار جب بنیادی تضاد ہاتھ آجائے اور اسے حل کر دیا جائے تو سارے مسائل یکدم حل ہو جائیں۔کیپٹلزم میں کارخانے اگر نجی ملکیت سے نکال کر پبلک ملکیت میں جائیں تو کیپٹلزم کے باقی تمام تضادات (غیر بنیادی) خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

کوالی ٹے ٹو انداز کے تضادات صرف اور صرف کوالی ٹے ٹو طریقے سے حل ہو سکتے ہیں۔ پرولتاریہ اور بورژوازی کے بیچ تضاد کوالی ٹے ٹو ہے۔اس لیے یہ صرف سوشلسٹ انقلاب سے حل ہو سکتا ہے۔ فیوڈلزم اور عوام الناس کے درمیان تضاد کوالی ٹے ٹو ہے۔اسے ڈیموکریٹک انقلاب سے حل کیا جا سکتا ہے۔امپیریلزم اور کالونی کے درمیان تضاد کوالی ٹے ٹو ہے۔یہ صرف قومی انقلاب سے حل ہو سکتا ہے۔

لیکن سوشلسٹ سماج میں ورکنگ کلاس اور کسان کلاس کے بیچ تضاد زراعت کو مشینی بنانے اور اجتماعی بنانے سے حل ہو جاتا ہے۔سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے اندر تضاد کرٹسزم اور سیلف کرٹسزم کے ذریعے حل ہو جاتا ہے۔

سماج اور نیچر کے بیچ تضاد پیداواری قوتوں کو ترقی دینے سے حل ہو جاتا ہے۔

کبھی بھی تضادات کو مساوی نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہر وقت بنیادی اور ثانوی تضادات میں فرق کرنا چاہیے۔البتہ یہ ضروری نہیں کہ ایک وقت کا بنیادی تضاد ہر وقت بنیادی ہی رہے۔ کبھی کبھی وہ ثانوی بن جاتا ہے۔اسی طرح کبھی کبھی ثانوی تضاد بنیادی تضاد بن کر سامنے آجاتا ہے۔جیسے کہ فیوڈل سماج میں کیپٹلزم ایک ماتحت قوت تھا، مگر وہ کیپٹلسٹ

سماج میں نمایاں قوت بن جاتا ہے۔اسی طرح کیپٹلسٹ سماج میں فیوڈلزم نمایاں کے بجائے اب ثانوی تضاد بن جاتا ہے۔

کبھی کبھی بنیادی تضاد دھند میں ہوتا ہے۔انقلابی قوتوں کا عمل اس دھند کو چھٹا دیتا ہے۔ اور وہ دھندوالا تضاد، واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

***

لہذا ساری جدوجہد، اور ساری جنگیں، دراصل خیر و شر کے بیچ جدوجہد ہے۔یعنی چیزیں، اجسام اور حالات ارتقا مانگتے ہیں مگر ''شر'' کی قیادت میں ایک پوری رجمنٹ ایسا کرنے نہیں دیتی۔لہذا دونوں کے بیچ ہمیشہ سے زندو مرگ والی جدوجہد جاری ہے۔ اس جدوجہد کے اپنے اصول اور قوانین ہیں۔انہی قوانین کو اگر ''خیر'' نے سمجھ کر سوچ کر استعمال کیا تو جیت خیر (ارتقا) کی ہے اور اگر اُس کے دشمن نے اُن قوانین کو اچھی طرح سمجھا اور حالات پر ٹھیک ٹھیک اطلاق کیا تو وہ جیت جاتا ہے۔شر کی جیت ہوتی تو وقتی ہے مگر کبھی کبھی یہ ''وقتی'' وقت دہائیوں تک طویل ہوتا ہے۔کبھی کبھی جب دونوں اِن قوانین کو ٹھیک ٹھیک برتتے ہیں، یا دونوں ہی غلط برتتے ہیں تو دونوں ہی برباد ہو جاتے ہیں۔اور یہ جاری کھیل ایک بار پھر نئے سرے سے شروع ہو جاتا ہے۔

یہ جو قوانین ہوتے ہیں ناں، یہ سو فیصد زمینی ہوتے ہیں، دنیاوی ہوتے ہیں۔یعنی ساری الائیں بلائیں یہیں سماج کی کوکھ سے ہی جنم لیتی ہیں۔رام اور راونڑ کی لڑائی جیسی اساطیری داستان میں خواہ جس قدر اساطیری آمیزشیں ہوں مگر پوری طویل جنگ دنیاوی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔یعنی قوانین صرف اور صرف دنیا کے ہوتے ہیں، دنیا اور کائنات سے باہر کے بالکل بھی نہیں۔اور یہ قوانین جنم بھی دنیا کے اندرونی تضادات سے لیتے ہیں۔

جب آپ سماج میں تبدیلی کے موضوع پہ بات کر رہے ہیں تو اصل میں آپ سماج کے

متعلق بات کر رہے ہیں۔اور سماج کا سیکریٹری جنرل تو انسان ہے۔انسان، متحرک اور تخلیقی انسان ۔ یہ انسان معاشی سرگرمیاں کرتا ہے، اُس سے سماجی معاملات پیدا ہوتے ہیں اور سیاست پیدا ہوتی ہے۔یعنی انسانی معاشی سرگرمی، دنیا میں خیر وشر کی ہر لڑائی کا مرکزہ ہوتی ہے ۔

معاشی سرگرمی ایک معاشی نظام کو جنم دیتی ہے۔اِس معاشی نظام میں معاشی طبقات پیدا ہوتے ہیں، اِن طبقات میں باہمی تضاد ہوتے ہیں اور انہی تضادات سے طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ساری سیاست، صحافت، ثقافت، اخلاق، ہلاکت اسی طبقاتی کشمکش کے حاملہ پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔

سادہ بات یہ ہے کہ سارا جھگڑا، ساری تقریریں، ترانے گانے اس بات سے وابستہ ہیں کہ جس جگہ پیداوار ہوتی ہے وہ پیداواری جگہ (فیکٹری، کھیت) ملکیت کس کی ہے؟۔آیا وہ مشترکہ ہے یا شخصی؟۔اگر پیداوار کی جگہ زمینیں ہیں اور وہ زمینیں ایک شخص کی ہیں، اور بقیہ آبادی محض کسان اور بزگر ہے تو وہ نظام فیوڈل کہلائے گا۔اسی طرح اگر پیداوار فیکٹری اور کارخانے میں ہوتی ہے اور اگر اُس کی ملکیت نجی ہے تو اسے کیپٹلزم کہتے ہیں۔

اس لیے سماج کے معاشی نظام اور اس معاشی نظام کے تضادات کو تلاش کرنا اور معاشی نظام کے طبقات اور ان کی باہمی کشمکش کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

یہاں دیکھیے تو ہمارے سماج کا انتظام جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔اس سماج میں دوسرا حصہ مزدور، کسان، ماہی گیر، اور چرواہوں جیسے محنت کرنے والوں پر مشتمل ہے ۔ یہ دونوں طبقات، مفاد کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متضاد ہیں متصادم ہیں۔انہی تضادات کی وجہ سے یہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہیں۔

یہاں ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہو جاتا ہے: سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی۔اُس میں بھی بس ایک بات: سائنس اور ٹکنالوجی خواہ کم ترقی یافتہ ہوں یا زیادہ، یہ آلہ ہوتے ہی

بورژوازی کے ہیں۔اِدھر اُدھر کے معمولی یا غیر معمولی اثرات کے باوجود یہ طبقاتی پوزیشنوں میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لاتے۔سائنس وٹکنالوجی خواہ جتنی ترقی کرے، مگر محض ''اس'' کے زور سے سماج میں مراثیوں کے بچے پنڈ کے چودھری نہیں بن سکتے۔

محنت کرنے والوں اور مالکوں کے اندر پیدا ہونے والے تضادات ہمیشہ اپنا اظہار طبقاتی مفادات کے تصادم کے بطور کرتے ہیں۔محنت کرنے والوں میں شعور آجاتا ہے ۔وہ نجات کے نظریات کی تلاش میں ہوتے ہیں۔اور پھر وہ متحدہ طور پہ اس شعور ونظریات کی قیادت میں مالک طبقات سے بھڑ جاتے ہیں۔محنت کرنے والے چاہتے ہیں کہ نجی ملکیت کے خاتمے سے وہ جبر واستحصال کی زنجیریں توڑ دیں اور سماجی قوتوں کی از سرنو تنظیم کریں۔۔۔۔ اور اس تصادم کا بلند ترین اظہار سماجی انقلاب ہے۔

اِس طویل طبقاتی لڑائی میں دانشور، ادیب، شاعر اور اعلیٰ جنشیا کا رول بنیادی نہیں ہے۔ مارکسسٹ دانشور البتہ طبقاتی سیاست میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اور بورژوا دانشور اَن پڑھ اکثریت والے محکوم طبقے کو گمراہ کرتے ہیں، وہ اُن دونوں طبقات کے مفادات کے ٹکراؤ کو چھپاتے ہیں، اور سماج میں طبقات کی بنیاد پہ موجود تضادات کو کُند کرتے ہیں۔ایماندار اور عوامی دانشور جتنا زیادہ زور آور اور زیردست طبقات کے درمیان مفادات کے تضاد کے انکشاف پر زور دیں گے، اتنی ہی جلد طبقاتی تضاد آگے بڑھے گا اور محنت کش اپنے طبقاتی شعور کی مدد سے اپنے طبقاتی دشمن کو شناخت کر لیں گے۔

3۔ اندرونی تضاد اور بیرونی تضاد

اصل اہمیت اندرونی تضادات ہی کی ہے۔سماج کے اندر طبقاتی تضاد اہم ہے۔اور بیرونی تضاد معاون تو ہو سکتا ہے فیصلہ کن نہیں۔انقلاب کبھی بھی بیرونی طرف سے، اوپر سے، خواہش سے، پہلوانی سے، دعا سے، اور حکم سے نہیں لایا جا سکتا۔خواہ سوپر پاور بھی آپ کے

ساتھ ہو۔ اگر اندرونی طبقاتی بنیادی تضاد کی گہرائی موجود نہ ہوتو انقلاب نہیں آسکتا، آ گیا تو مستحکم نہیں رہتا۔

بلوچستان میں قبیلوی سماج کی باقیات ابھی جاندار طریقے سے موجود ہیں۔ جو تیزی کے ساتھ فیوڈلزم میں ڈھلتا جارہا ہے۔ یعنی قبیلوی اور فیوڈل تضادات بھرپور طور پر موجود ہیں۔ یہاں متوازی صورت میں کپٹلزم (معدن، ماہی گیر، ریل وبجلی اور پوسٹ اور مسافر وگڈز ٹرانسپورٹ) موجود ہے۔

اسی طرح بلوچستان کا ایک تضاد پنجاب یا وفاق سے ہے۔ بہت زوردار تضاد۔ اسی طرح بین الاقوامی سامراج سے بھی تضاد موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں عوام اور سردار کے بیچ، کسان اور فیوڈل کے درمیان، مزدور اور سرمایہ دار میں، پنجاب اور بلوچ عوام کے درمیان، اور بین الاقوامی سامراج اور بلوچ کے درمیان بنیادی تضاد موجود ہے۔ اِن سب کو حل کیے بغیر سماج آگے نہیں بڑھ سکتا۔

بیرونی تضاد مگر، قطعاً غیر متعلق بھی نہیں ہوتے۔ یہ نشوونما، ارتقا اور تبدیلی میں مددگار بھی ہوسکتے ہیں، رکاوٹ بھی بن سکتے ہیں۔ مثلاً امریکی سامراج گزشتہ سو برسوں سے کامیابی کے ساتھ بے شمار ممالک کے خلاف اپنی کاروائیوں سازشوں، معاشی ناکہ بندیوں سے ان ممالک کا گلا گھونٹے رکھتا ہے۔ انہیں آگے بڑھنے ہی نہیں دیتا۔ کیوبا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح افغانستان کے انقلاب کا گلہ سعودی عرب، پاکستان، ایران، امریکہ اور یورپ نے مل کر گھونٹ دیا۔ اس لیے بیرونی تضاد کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

سوویت یونین اور سوشلسٹ ممالک کے خاتمے کے بعد سے دنیا میں تین بڑے تضادات موجود ہیں۔ ہمیں دنیا کو سمجھنے کے لیے اُس میں موجود تینوں بڑے تضادات کو دیکھنا ہوگا۔ یہ تضادات سیاسی سماجی ورکر اور دانشور کو حفظ ہونے چاہییں۔ ان میں سے کسی بھی ایک تضاد کو نظر انداز کرنے سے دنیا کی سمجھ نہیں آسکتی۔ دنیا میں رونما ہونے والے سارے بڑے سیاسی فوجی اور معاشی واقعات کی تہہ میں یہی تین تضادات موجود ملیں گے۔ یہ ایسے تضادات ہیں جو کہ بنیادی بھی ہیں اور جنگ کے بغیر اُن کا حل بھی کوئی نہیں۔

پہلا تضاد:

طاقتور کپٹلسٹ ملکوں کے اپنے مابین ایک طاقتور تضاد موجود ہے۔ اُن کے بیچ تضاد اس بات پہ ہے کہ دنیا کی لوٹ مار میں کس کا حصہ کم ہو اور کس کا زیادہ۔ ہر سامراجی ملک یہ چاہتا ہے کہ غریب ممالک کے وسائل کی لوٹ میں اُس کا حصہ دوسرے سے زیادہ ہو۔ یہ تضاد اس قدر سنگین ہے کہ ماضی میں لوٹ میں حصہ بڑھانے کے چکر میں سرمایہ دار ممالک نے آپس میں زبردست جنگیں لڑی ہیں۔ اس تضاد کے سبب چھوٹی موٹی تو بے شمار جنگیں ہوئیں، لیکن اس بڑے تضاد نے دنیا کو دو بڑی عالمی جنگوں تک میں جھونک دیا تھا۔ ایک دوسرے کو ایٹم بم تک مارے تھے۔

دوسرا تضاد:

کمزور ملکوں کا سامراجی ملکوں کے ساتھ تضاد۔ کمزور ملک کا ارمان ہے کہ اس کی معاشی اور سیاسی خودمختاری بحال ہو۔ وہ اپنے وسائل دوسرے طاقتور ملکوں کو چھیننے نہ دے، بلکہ اپنے غریب عوام پر خرچ کرے۔ مگر طاقتور ملک ایسا کرنے نہیں دیتے۔

تیسرا تضاد:

ہر ملک کے اپنے اندر، وہاں کے حکمران طبقے کا اپنے محنت کش طبقات سے تضاد موجود ہے۔ بالادست طبقہ طاقت اور استادی استعمال کر کے ملک کے وسائل لوٹ کر، اور مزدور کی محنت کا استحصال کر کے اپنی دولت بڑھاتا ہے۔ مگر نچلا محکوم طبقہ ان تھک مشقت کے باوجود سُکھی زندگی کے لیے ترستا رہتا ہے۔ اس کے پاس رہنے کو گھر نہیں ہے، روزگار نہیں ہے، تعلیم وصحت نہیں ہے۔ اس کے باوجود کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے پیداوار کے ڈھیر لگا

رکھے ہیں۔مگرسب کچھ جاگیردارکا،زردارکا۔ یہ تضادطبقاتی تضادکہلاتا ہے۔

15

کوانٹی ٹی، اور کوالٹی

Quantity & Quality

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ دنیا تیار اور مکمل کردہ چیزیں نہیں رکھتی۔ دنیا تو اُن پراسیسوں کی کُل حاصل کی نمائندگی کرتی ہے جو مستقل طور پر تبدیل ہو رہے ہیں، وجود میں آ رہے ہیں اور تباہ ہو رہے ہیں۔

ترقی کا عمل فوری بھی نہیں ہے اور ایک سیدھی لکیر کی طرح بھی نہیں ہے۔ بلکہ اُس میں عرصے تک چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ انہیں ہم کوانٹی ٹے ٹو تبدیلیاں کہتے ہیں۔ اُس مرحلے کے بعد یکا یک تیز رفتار اور دھماکہ خیز تبدیلی کے ادوار آتے ہیں جن میں کوانٹٹی کوالٹی میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

یعنی تغیر یا تبدیلی دو قسم کی ہوتی ہے۔ جب کوئی چیز اپنی اصل صورت میں رہ کر بدلتی جاتی ہے تو اُسے ''کوانٹی ٹے ٹو'' (مقداری) تبدیلی کہتے ہیں۔ جب وہ چیز مقداری تبدیلیوں کے نتیجے میں اپنی صورت بدل کر بالکل صورت ہی دوسری اختیار کر لیتی ہے تو اسے ''کوالی ٹے ٹو ''تبدیلی کہتے ہیں۔

اس سارے قانون کو ''کوانٹٹی کی کوالٹی میں تبدیلی'' کا اصول کہتے ہیں۔

کوالٹی

کسی شئے کی لازمی خاصیت کی وجہ سے ہی یہ وہی شئے رہتی ہے، اور کوئی دوسری نہیں بنتی ۔کسی شئے کی کوالٹی اس کی الگ الگ خصوصیات میں کم نہیں کی جا سکتی۔ کوالٹی مجموعی طور پر شئے کے وجود کے ساتھ مکمل طور پر جڑی ہوتی ہے اور اُس سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کوالٹی کا تصور ایک شئے کے وجود سے جڑا ہوتا ہے۔ ایک شئے خود کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی کوالٹی ضائع نہیں کر سکتی۔

کوالٹی وجود کی حالت کا پیمانہ ہوتی ہے۔ فلاں چیز کس طرح بنی، یا وہ دوسری چیزوں سے کیسے مختلف ہے۔ کوالٹی کی ڈیفی نیشن یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص خصوصیت ہے۔ اس کی مثالیں ہمدردی، سچائی، خوبصورتی وغیرہ ہیں۔

کسی شئے میں ممکن نہیں کہ صرف کوانٹی ٹی ہو اور کوالٹی نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی شئے صرف کوالٹی رکھے اور کوانٹی ٹی کے بغیر ہو۔ یہ دونوں بہ یک وقت موجود ہوتی ہیں۔

اگر سماجی طور پر دیکھیں تو قدیم کمیونزم کی کوالٹی اور خصوصیت یہ تھی کہ ملکیت مشترک تھی، محنت بھی مشترک تھی اور اُس سے حاصل شدہ پیداوار بھی مشترک تھی۔ غلام داری میں ملکیت تو آقا کی ہوتی تھی مگر محنت غلام کرتا تھا، اور پیداوار آقا کی ہوتی تھی۔ فیوڈلزم کی خاصیت یہ تھی کہ ملکیت فیوڈل کی ہوتی تھی، مظالم اُسی کے، محنت اور عدم آزادی کسان کی ہوتی تھی، اور پیداوار فیوڈل کی۔ کیپٹلزم کی کوالٹی یہ ہے کہ وہاں سب کچھ کا مالک کیپٹلسٹ ہے اور ساری محرومی مزدور طبقے کی۔

کوالٹی کبھی بھی لولا کی نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی یہ ہر جگہ کے لیے یونیفارم ہوگی۔ مثلاً اگر آپ دراز قدی کی بات کریں تو لمبے قد والے امریکیوں میں دراز قدی کا تصور کچھ اور ہوگا، اور کوتاہ قد تھائی لینڈ والوں میں دراز قدی کچھ اور جانی جائے گی۔

اسی طرح حُسن کے بارے میں افریقہ اور یورپی لوگوں میں الٹ تصور موجود ہے۔

آپ فرمانبرداری کی بات کریں تو ہر معاشرے میں وہ مختلف ہوگی۔ آپ رحم دلی ،وفاداری اور حب الوطنی کی بات کریں تو اُس کے معیار ہر جگہ مختلف ہوتے ہیں۔ مگر اگر یہی باتیں آپ کوانٹی ٹے ٹو انداز میں کریں تو ایگزیگٹ اور عالمگیر بات ہو جائے گی۔

کوانٹی ٹی

ساری اشیاء کوالی ٹیٹو قطعیت کے ساتھ ساتھ کوانٹی ٹیٹو قطعیت بھی رکھتی ہیں۔ ساری اشیا ایک واضح ڈیل ڈول، تعداد، اور حجم رکھتی ہیں۔ کوانٹٹی تو مقررہ حد، سائز، یا کسی چیز کا کُل میزان ہوتی ہے۔ کوانٹی ٹی کو گنا جاسکتا ہے، یا ناپا جاسکتا ہے، یا تولا جاسکتا ہے اور اس کا اظہار نمبرز میں کیا جاتا ہے۔ فلاں کا قد میٹروں سنٹی میٹروں میں کتنا ہے؟۔ اُس بوری کا وزن کتنے کلوگرام ہے۔

کوالٹی کے برعکس کوانٹی ٹی ایک شئے کے وجود کے ساتھ بہت زیادہ جڑی نہیں ہوتی۔

کوالٹی سب جیکٹو ہے۔ مگر کوانٹی ٹی سب جیکٹو نہیں ہوتی۔

یہ بھی اصول ہے کہ کوانٹی ٹی کوالٹی میں بدل جاتی ہے اور کوالٹی کوانٹی ٹی میں۔ کوانٹی ٹی سے کوالٹی میں ڈھل جانا ایک بنیادی قانون ہے۔ یہ جدید کے نمودار ہونے کا قانون ہوتا ہے، ترقی کا قانون ہوتا ہے۔ یہ قانون بتاتا ہے کہ ایک کوالٹی سے دوسری کوالٹی میں لپک کر ڈھل جانے کا پراسیس کیا ہوتا ہے۔ مگر یہ تبدیلی کبھی بھی حادثاتی نہیں ہوتی۔ یہ ایک پراسیس کے نتیجے میں برپا ہوتی ہے جس کے قوانین موجود ہیں۔

ہر شئے دوسری اشیا سے ہزاروں دھاگوں سے بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ اُن کے ساتھ گوناگوں رشتوں میں منسلک ہوتی ہے۔

جیسے کہ ذکر ہوا کہ جب کوئی چیز اپنی اصل صورت میں رہ کر قطرہ قطرہ بدلتی جاتی ہے تو ایسی تبدیلی کو کوانٹی ٹے ٹو تبدیلی کہتے ہیں۔ اور یہ قطرہ قطرہ تبدیلی سطح کے نیچے ہوتی رہتی ہے۔ مگر اگر ان قطرہ قطرہ تبدیلیوں کے نتیجے میں بالآخر اس کی حالت ہی بدل جاتی ہو تو وہ کوالی ٹیٹو تبدیلی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ کوانٹی ٹیٹو تبدیلیاں شئے کی تباہی کی طرف، یا لازمی تبدیلی کی طرف یک دم نہیں لے جاتیں۔ بلکہ ہر شئے کے لیے صرف ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد ہی کوانٹی ٹیٹو تبدیلیاں کوالی ٹے ٹو تبدیلیاں لاتی ہیں۔

پانی کو لیکوئڈ سے گیس یعنی بھاپ بنانا ہو تو اسے حرارت دینا پڑتی ہے۔ یہ پانی یک دم

نہیں کھولتا۔ اُس کا تو ایک ایک مالیکیول گرم ہوجاتا ہے۔ وہ گرم مالیکیول انرجی حاصل کرتا ہے اور اوپر کی جانب حرکت کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کی خالی کردہ جگہ دوسرا ٹھنڈا مالیکیول لے لیتا ہے اور پھر وہ بھی گرم ہو کر اوپر جاتا ہے۔ یوں کوانٹی ٹی بدلتی جاتی ہے ۔ بالآخر 100 ڈگری سیلسی اس پہ جب سارے مالیکیول گرم ہوجاتے ہیں۔ تب پانی یک لخت چھلانگ لگا کر جوش کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اپنی صورت تبدیل کر کے یہ پانی گیس یعنی بھاپ کی شکل اختیار کرے گا۔ یہ ہے کوالی ٹے ٹو تبدیلی۔ یعنی اب تک جو چیز پانی تھا اُسے پیا جاسکتا تھا، کپڑے اور برتن دھوئے جاسکتے تھے۔ اُس کے اندر انگلی گھمائی جاسکتی تھی۔۔۔ مگر اب اس کی کوالٹی بدل گئی۔ یہ اب بھاپ بن گیا۔ بھاپ پانی والے کام نہیں کرسکتا۔ خصوصیت ہی بدل گئی۔

اسی طرح اگر پانی کو ٹھنڈا کرتے جائیں تو بالآخر وہ پانی نہیں رہتا، ٹھوس یعنی برف بن جاتا ہے۔ اِس صورت میں اب پانی سے برف (ٹھوس) بنی ہوئی شئے کی خاصیتیں پانی والی نہیں رہیں۔

کوانٹی ٹے ٹو رشتوں کا مطالعہ میتھی میٹکس کرتا ہے۔

ایک اور قانون بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب کوانٹی ٹے ٹو تبدیلی آرہی ہو تو شروع میں اُس کی رفتار کم ہوتی ہے۔ جس میں پہلے پہل تو معمولی اور ناقابل مشاہدہ مقداری تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً پانی کو گرم کرتے ہوئے یہی کچھ ہوتا ہے۔ البتہ جب سارے مالیکیول گرم ہوجاتے ہیں تو کوانٹی ٹے ٹو تبدیلی کی رفتار بہت تیز ہوتی جاتی ہے۔ اور کوالی ٹے ٹو تبدیلی کے وقت تو یہ رفتار بہت تیز ہوجاتی ہے۔

اور اس سے بھی ایک دلچسپ قانون یہ ہے کہ کوالی ٹے ٹو تبدیلی کے لیے آخری مالیکیول کا گرم ہونا بھی لازمی شرط ہوتی ہے۔ ورنہ یہ تبدیلی ممکن نہیں۔

ہر شئے ہر وقت پراسیسوں کے ایک سلسلے میں ہوتی ہے۔ پراسیسز ایک مرحلہ تک آتے ہیں تو شئے کی صورت بدل جاتی ہے، اور پھر اگلا مرحلہ شروع ہوتا ہے، پھر اگلا، پھر

اگلا۔۔۔

قدیم کمیونزم سے ارتقا یافتہ اگلے نظام یعنی غلام داری سماج کی ہم سب توصیف کرتے ہیں۔تاریخ میں سارے لوگوں نے دنیا میں بادشاہت ختم کر کے سرمایہ دارانہ نظام قائم کرنے کی حمایت کی تھی۔سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کر کے سوشلزم کا قیام ہر ایک کو اچھا لگا تھا۔یہ ساری تبدیلیاں یعنی قدیم کمیونزم سے فیوڈلزم تک اور فیوڈلزم سے کپٹلزم تک، اور پھر کپٹلزم سے سوشلزم تک مکمل طور پر کوانٹی ٹی اور کوالٹی کے قانون کے مطابق ہوتی رہی ہیں۔

یہاں ایک اور قانون بھی موجود ہے۔کوانٹی ٹے ٹو تبدیلی مسلسل اور ترتیب کے ساتھ چلتے چلتے جب عروج پر پہنچتی ہے تو کوالی ٹے ٹو تبدیلی ایک چھلانگ کی صورت رونما ہوتی ہے ۔تب یہ بہت تیز رفتار تبدیلی ہوتی ہے۔یہ جو یک لخت صورت کا بدل جانا ہے۔یہ اہم قانون ہے۔اگر ہم اس قانون کا اطلاق کسی انسانی معاشرے پہ کریں تو اس کوالی ٹے ٹو تبدیلی کو انقلاب کہتے ہیں۔ایسا انقلاب، فرنچ انقلاب کے وقت ہوا تھا۔اسی طرح 1917 میں روس کے اندر بھی یہی کوالی ٹے ٹو تبدیلی آئی تھی۔مطلب یہ کہ انقلاب بغیر چھلانگ کے کبھی نہیں آتا۔

چنانچہ چھلانگ کو نظر انداز کر کے صرف کوانٹی ٹے ٹو تبدیلیوں پر آسرا رکھنا غلط بات ہے۔اسی طرح کوانٹی ٹے ٹو کو رد کر کے ہمہ وقت چھلانگوں کی بات کرنا بھی غلط ہے۔اس آخری بات کا مطلب یہ ہے کہ انقلابی تنظیم کے طویل اور دِقت طلب کام یعنی لوگوں کو باشعور بنانے، انہیں منظّم کرنے اور انقلابی عمل کے لیے بتدریج تیار کرنے کا کام ہرگز مسترد نہیں کیا جاسکتا۔یہی تو راستہ ہے جو چھلانگ تک لے جاتا ہے۔

ہاں، مگر کوانٹٹی اور کوالٹی والے اس قانون سے ہٹ کر، پارٹی انقلاب نہیں لاسکتی۔نہ ہی کوئی مہا عقلمند، کوئی پہلوان اور صلاحیتوں بھرا لیڈر یہ کام کرسکتا ہے۔یہ کوالٹی کو انٹٹی کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔اسی لیے یہ طے بات ہے کہ تبدیلی کسی عظیم آدمی یا اتفاقیہ واقعے

پر نہیں آتی۔یہ مکمل طور پر قوانین کے تابع کام ہے۔قوانین بتاتے ہیں کہ کوانٹی ٹے ٹو تبدیلیاں لازم ہیں۔اور ''کوالی ٹے ٹو'' تبدیلیاں لازم ہیں۔اور یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔اگر ''کوانٹی ٹے ٹو'' پہ زور دے کر انقلاب کو نظر انداز کرنا غلط ہے تو انقلاب انقلاب کہہ کر ''کوانٹی ٹے ٹو'' ارتقا سے انکار بھی غلط ہے۔سماجی انقلابات ناگزیر ہیں۔اس لیے کہ انقلاب مزدور طبقے کی تلخ زندگانی کے پروسیس کا نتیجہ ہوتا ہے۔پھر وہی کوانٹی ٹی اور کوالٹی کا قانون!۔مزدوروں کی زندگی عذاب بنتے بنتے جب آخری درجے پر پہنچتی ہے تو وہ اپنی سیاسی پارٹی کے گرد جمع ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ سماج کو کوالی ٹے ٹو تبدیلی کی طرف لے جاتے ہیں۔The last straw That breaks camel's back(مطلب لادتے جاؤ، لادتے جاؤ مگر جب برداشت کی آخری حد تک پہنچ جاتی ہے تو آخری تنکے پہ اونٹ کی کمر ٹوٹ جاتی ہے)۔ یا ایوب کے زمانے میں جب معاملات عوام کی برداشت سے زیادہ بگڑ گئے تو چینی کی قیمت میں محض چار آنے کے اضافہ نے ملک گیر ہڑادھڑی پیدا کردی تھی اور ایوب کا تختہ ہوگیا تھا۔

بعض انقلابات کوانٹی ٹے ٹو تبدیلی کے پراسیس میں نسبتاً کم وقت میں آجاتے ہیں اور بعض بہت وقت لیتے ہیں۔سماج کے بے شمار فیکٹرز اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟۔ظاہر ہے کہ خود کار انداز سے نہیں۔تاریخ کی پیش قدمی کوئی میکانکی سلسلہ عمل نہیں ہوتا۔معروضی اعتبار سے ابھرتی ہوئی قوتوں کو بھی کچھ عرصہ کے لیے روکا جاسکتا ہے۔اور حالانکہ یہ صحیح ہے کہ بالآخر فتح اُنہی کی ہوگی، مگر دیکھنا یہ ہے کہ انسانیت کو کتنی قربانیاں دینا ہوں گی۔اُسے کتنی اذیتیں سہنا ہوں گی، کتنا وقت حاصل کیا جائے گا یا پھر کھودیا جائے گا، اس سے پہلے کہ قدیم عہد اپنا زمانہ حمل مکمل کرے اور تاریخ کے متعین شدہ وارث جنم دے، اِن سب کا انحصار اس بات پر ہے کہ متضاد طبقات کی نسبتی طاقت کیا ہے اور وہ کتنے شعور کے ساتھ تاریخ کی پیش قدمی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

لیکن کہیں بھی عوام کے مقدر کا فیصلہ اُس کے حکمران طبقوں کے ہاتھوں میں نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہوسکتا ہے اور ہوتا بھی ہے کہ اپنی بقاء کے لیے حکمران طبقے عوام کے مقدر کے حصول میں کچھ عرصہ کے لیے رکاوٹیں پیدا کریں۔ لیکن تاریخ میں اس سچائی کے بہت سے دلائل ملتے ہیں کہ جب کسی حکمران طبقے کو نئی تاریخی قوتیں للکارتی ہیں تو اُس طبقے کے قدامت پسند تقاضے اُس کی بینائی پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور یوں وہ تاریخ کے ہم عصر تقاضوں کو نہیں پہچان سکتا۔

اس سلسلے میں عوامی دانشور کے کرنے کے کام یہ ہیں: تاریخ کی ترقی پسند قوتوں کے ساتھ کام کرنا، ان پہ پرانے عہد کی مہلک اصلیت کو واضح کرنا، اور معاشرے میں اُن قوتوں کی نشاندہی کرنا جو پرانے عہد کو برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں۔ تاریخ کی عقلی پیش قدمی کے بارے میں لوگوں کو بینائی عطا کرنا ہوتا ہے۔ اُنہیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ سماجی رشتوں کا اگلا تاریخی درجہ حاصل کرنا کیوں ضروری ہے، اور اُن کے وہاں تک پہنچنے کا راستہ کون سا ہے۔

ہر جگہ انقلاب ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ہر ملک کے اپنے داخلی خارجی سماجی معاشی اور سیاسی حالات ہوتے ہیں۔ مزدور کا شعور اور تنظیم کاری اور اتحاد، اسی طرح کپٹلسٹوں کی طاقت اور مزاحمت کی صلاحیتیں اور دیگر عوامل فیصلہ کن اثرات ڈالتے ہیں۔ سنگت اکیڈمی آف سائنسز، بلوچستان سنڈے پارٹی اور اُن سے وابستہ ساتھی اسی کوانٹی ٹی والی تبدیلی سے کوالی ٹے ٹو تبدیلی کے سفر میں نچلے طبقے کی قیادت اور مدد کرتے ہیں۔

یہ بات حتمی ہے کہ کپٹلزم سے سوشلزم میں کوالی ٹے ٹو تبدیلی صرف ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے۔

قدیم کے پیٹ میں سے جدید کی حمایت کرنا قانون ہے۔ کوئی بھی سماجی نظام ''اٹل'' نہیں ہوتا۔ ہمیشہ نئے ابھرنے کے امکانات رکھنے والے طبقات پہ نگاہیں مرکوز رکھنی چاہییں۔ مثلاً ہم سب کو معلوم ہے کہ ہمارے خطے میں مزدور طبقہ کم ہے، بے شعور ہے، غیر منظّم ہے اور اُس کی لیڈرشپ کرپٹ ہے۔ مگر ابھرنا اُسی طبقے نے ہے۔ سماج میں کوالی ٹے ٹو تبدیلیوں کا ہر

نفی کی نفی کا قانون

Negation of the Negation

ہم آپ گندم سے بہت واقف ہیں جو ہماری روزی ہے۔ہم بلوچستان میں ہر سال نومبر کے آس پاس گندم کے دانوں کو بیج کے بطور زمین میں با قاعدہ دفن کر کے اس کی نفی کر رہے ہوتے ہیں ۔مگر کچھ ہفتوں بعد پھر وہ دانہ نہیں رہتا۔یعنی وہ دانے کی حیثیت سے اپنے اِس وجود کی نفی کرتا ہے اور پودے میں بدل جاتا ہے۔یہی گندم کا پودا پھر مارچ کے اواخر میں مکمل طور پر اپنی نفی کرتا ہے اور بے شمار گندم کے دانے اور بھوسہ پیدا کر کے خود مر جاتا ہے۔

مگر گندم کے اسی نئے دانے میں پودے اور بیج والے دانے دونوں کا جوہر محفوظ رہتا ہے۔قدیم جدید میں بدل جاتا ہے۔۔۔۔مگر سلسلہ یہاں رکتا نہیں۔بلکہ اب وہی جدید پھر اپنی باری پر بڈھا ہو کر ''جوانوں'' کو جنم دیتا ہے۔ارتقا یہی تو ہے۔سماجی نظام میں اس قانون کو لاگو ضرور کریں۔

اسی طرح انڈا دیکھیے۔یہ ایک خاص وقت اور ٹمپریچر کے بعد اپنی نفی کرتا ہے۔چوزہ نامی اثبات بنتا ہے۔یہ چوزہ مرغی میں بدلتا ہے۔

غلام داری سماج کی نفی اُس کے اندر سے فیوڈلزم نے کی، فیوڈلزم کی نفی اُس کے اندر سے کیپٹلزم نے کی اور ہم نے دیکھا کہ اسی کیپٹلزم کے اندر سے اس کی نفی یعنی سوشلزم آیا۔

یہ نفی باہر سے انجیکٹ نہیں کی جاسکتی۔نفی چیز یا مظہر کے اندر موجود ہوتی ہے۔نگیشن قدیم سے جدید کی طرف عبور ہے۔ اور یہ نفی کبھی بھی بے کار اور بے مقصد نہیں ہوتی۔لہذا یہ سادہ equation نہیں ہے کہ نفی میں سے نفی نکل کر پچھلی نفی کا سب کچھ برباد کر دے۔نہیں۔ قانون یہ ہے: نئی نفی پرانی نفی سے اپنے لیے بہت سی کارآمد چیزیں لے کر اُس کی جگہ لیتی ہے۔نئی نفی پرانی نفی سے اپنی بقا اور ترقی کے لیے کارآمد چیزیں لے کر آگے بڑھتی ہے۔نفی کی

نفی کا قانون سماجی بربادی کی طرف نہیں بلکہ سماجی نشوونما کی طرف بڑھتی ہے۔ایسا کرنے کے پراسیس میں یہ نئی نفی خود پرانی ہوتی جاتی ہے۔اور اُس کی کوکھ سے خود اس کی نفی کی نشوونما شروع اور جاری رہتی ہے۔مطلب یہ کہ نئی کو اپنی باری پہ بہرصورت نگیشن کا شکار ہونا ہوتا ہے۔ہر نئی چیز ہمیشہ نئی نہیں رہتی۔ بلکہ ارتقا کے سفر میں اپنا حصہ ڈال کر قدیم ہوتی جاتی ہے۔ ہوتے ہوتے یہی کوکھ والی نفی اپنی نشوونما میں ایک ایسی جگہ پہنچ جاتی ہے کہ اپنی ''ماں نفی'' سے اپنا توشہ لے کر، اُسے نفی کرتے ہوئے خود ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ جاتی ہے۔اب وہ ''ماں نفی'' کی نسبت زیادہ جدید، زیادہ کارآمد، اور زیادہ ارتقاپذیر بن کر آ گئی۔دوسرے لفظوں میں نئی نفی نے پرانی نفی کو مکمل طور پر نیست و نابود نہیں کیا بلکہ اُس کی مضر چیزوں کو نیست و نابود کر دیا۔اور اپنی ترقی کے لیے پرانی نفی کے مفید عناصر کو ساتھ لے لیا۔قانون: قدیم نفی کی بے کار شدہ چیزوں کو ''برباد'' اور کارآمد چیزوں کو ''برقرار'' رکھنا۔

استحصالی کیپٹلسٹ نظام ایک ایسے سوشلسٹ انقلاب سے ہٹا دیا جاتا ہے جو نفی کی نفی کرتا ہے، کیپٹلزم کے جوہر ہی کو یعنی بورژوازی کی طرف سے پرولتاریہ کے استحصال کو نفی کرتا ہے۔ مگر بہت عرصے سے پھیلائی ہوئی پاپولر غلطی کو درست کرنا ضروری ہے۔درستگی یہ ہے:

سوشلسٹ انقلاب بورژوازی نامی نفی کو مکمل برباد نہیں کرتا بلکہ مرتے ہوئے بورژوا سماج سے وہ چیزیں لے لیتا ہے جو سوشلسٹ انقلاب کی نشوونما میں مدد دیں۔

نفی کی نفی کے قانون کے نتیجے میں نشوونما ہوتی رہتی ہے۔مگر، نشوونما نہ تو سیدھی لائن میں ہوتی ہے اور نہ ہی بند دائرے میں۔ نیچے سے اوپر کی طرف جاتی یہ نشوونما spiral انداز میں ہوتی ہے۔ یہ نشوونما پیچیدہ طریقوں سے، متضاد انداز میں بہت سے مڑے تڑے راستوں سے گزرتا ہوا نیچے سے اوپر کو جاتا ہے جن میں انفرادی مرحلوں میں رجعت پسند حرکت بھی شامل ہوتی ہے۔ انسانی تاریخ میں اس امتیازی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک فلاسفر نے کہا تھا کہ: ''عالمی تاریخ کے کاز کو کبھی کبھار پیچھے کی طرف بڑی پھلانگوں کے بغیر

ہمیشہ ہموار طور پر آگے کی سمت بڑھتے سمجھنا غیر ڈائلکٹیکل، غیر سائنسی اور نظریاتی طور پر غلط ہے''۔

فارم اور کانٹینٹ

ایک ماچس کے اندر موجود تیلیاں ''کانٹینٹ'' ہیں اور خود ماچس کی ڈبی ''فارم'' ہے۔ ماچس کی ڈبی اور تیلیاں ایک مخصوص شکل وصورت اور تعداد وترتیب میں بنی ہیں۔ ماچس کی ڈبی (فارم) کو محض اُس کی ظاہری شکل سے جانا نہیں جاسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تیلیوں (کانٹنٹ) کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ تیلیاں (کانٹنٹ) فارم کے لیے فیصلہ کن ہیں۔ اگر ماچس کی ڈبیہ چالیس تیلیوں کی گنجائش والی ہے اور اس میں 200 تیلیاں ڈال دی جائیں تو ماچس یا تو پھٹ کر نئی شکل اختیار کر لے گی۔ اگر پھٹ نہ بھی جائے تو اُس کی صورت (فارم) بدل جائے گی۔

ماچس کی تو خیر ہے کہ اُس کی تیلیاں باہر سے ڈالی جاتی ہیں۔ مگر اگر انڈے کی بات کی جائے تو معاملہ ذرا پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اُس کا چوزہ تو اندر سے بڑھتا رہتا ہے۔

انڈے کا شیل ''فارم'' ہوتا ہے اور اُس کے اندر چوزہ ''کانٹینٹ''۔

انڈے کے شَیل کے اندر چوزے کے لیے آرام دِہ سپس اور خوراک موجود ہوتی ہے۔ چوزہ اُس کے اندر پلتا پھولتا جاتا ہے۔ اس لیے کہ پلنا پھولنا چوزے کی خصوصیت ہے۔ انڈے کے شیل کے اندر ہی یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ مگر انڈہ بدقسمت ہے کہ کیلشیم کاربونیٹ سے بنا اُس کا شیل عورت کے پیٹ کی طرح الاسٹک نہیں ہوتا۔ انڈہ اگر بڑا ہوتے ہوئے چوزے کے ساتھ ساتھ خود اپنے شیل کو بھی پُھلا دینے کے قابل ہوتا تو شَیل کی تباہی نہ آتی۔ مگر انڈے کی بدقسمتی یہ ہے کہ اُس کا شیل یعنی یا فارم تو اٹل، جامد، ساکن، اور نا قابل تغیر ہے۔

چنانچہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ چوزے کے لیے جگہ کم پڑ جاتی ہے۔ تو اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ چوزہ بڑھنا بند کر دے۔ اُس (کانٹنٹ) نے تو بڑھنا ہی ہے۔ چنانچہ ایک مرحلے پر جا کر چوزہ (کانٹنٹ) شیل (فارم) کو توڑ کر، اور اسے برباد کر کے باہر نکل آتا ہے۔ مطلب

فارم کو رضا کارانہ یا پھر بزورِ قوت کانٹنٹ کی بڑھوتری کو Facilitate کرنا پڑتا ہے۔صرف وہی فارم بچ سکے گا جو ابھرتے ، بڑھتے ، اور ارتقا کرتے کانٹنٹ کا ساتھ دے گا۔ وگرنہ نشوونما کرتے کرتے کانٹینٹ فارم کو بدل ڈالتا ہے۔یعنی کانٹینٹ فارم کا تعین کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں کانٹنٹ اُن عناصر اور پراسیسوں کا کُل ہے جو چیزوں کی بنیاد بناتے ہیں اور جو اُن کے فارموں کے وجود، ڈولپمنٹ اور تواتر کو متعین کرتے ہیں۔

فارم، تنظیم کا داخلی کنکشن اور میتھڈ بناتا ہے۔ یہ فناں مناں کے عناصر اور پراسیسوں کا آپس میں اور انوائرمنٹ کے ساتھ انٹرایکشن ظاہر کرتا ہے۔ اسی لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ صرف کانٹنٹ ہی اہم ہوتا ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اگر فارم مطابقت والا ہو تو کانٹنٹ کی ترقی کو بھی زبردست مدد دیتا ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ فارم اور کانٹنٹ اشیا کے اتحاد، سالمیت اور نشوونما کے داخلی سرچشموں کو ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ فارم اور کانٹینٹ الگ الگ چیزیں ہوتے ہوئے بھی ایک وحدت ہوتے ہیں۔ کانٹینٹ کے بغیر فارم نہیں اور فارم کے بغیر کانٹینٹ نہیں ۔ فارم کانٹینٹ کی نمائندگی کرتا ہے۔ کانٹینٹ فیصلہ کن، مگر فارم بھی جب تک فعال رہتا ہے موثر ہی رہتا ہے۔

فارم گو کہ کانٹینٹ پہ انحصار کرتا ہے مگر یہ بہت سرگرمی کے ساتھ کانٹینٹ پر اثر انداز بھی ہوتا ہے ۔ وہ اس کی نشوونما میں مدد بھی دیتا ہے ۔ انڈے کا شیل محض کانٹنٹ یعنی چوزے کا حفاظتی قلعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ اسے باہر سے ہوا اور نمی بھی مہیا کرتا رہتا ہے۔ مگر یہ حتمی بات ہے کہ ایک جگہ جا کر فارم کانٹنٹ کی لامحدود ڈویلپمنٹ کے امکان کا ساتھ دینے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ تب وہ اُس کی بڑھوتری کو روکنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ پہلے کم کم مگر، پھر پورا تن من لگا کر۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر فارم کانٹینٹ سے مطابقت رکھتا ہو تو وہ اُس کی نشوونما اور پیش قدمی کو تقویت دیتا ہے۔ مگر جوں جوں فارم پرانا ہوتا جاتا ہے تو وہ کانٹینٹ سے مزید مطابقت

رکھنے سے معذور ہوتا جاتا ہے۔ اُس کے سجدے طویل ہونے لگتے ہیں، رویے اور لوچ سخت ہونے لگتے ہیں۔ اور چونکہ یہ خود کو بدلنے سے قاصر ہوتا ہے اس لیے اب وہ کانٹنٹ کی بڑھوتری پہ حسد کرنے لگتا ہے، اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے، اسے محدود کرنے کی تگ و دو کرتا ہے، اس کا رقیب بن جاتا ہے۔ تب وہ کانٹنٹ کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔۔ اور پھر ایک سٹیج پہ جا کر دونوں کے بیچ بقا کی جہد شروع ہو جاتی ہے۔

یہ صرف کرسی کی جنگ نہیں ہے، یہ بقا کی جنگ ہے۔ مضمحل شدہ فارم اور بھرپور متحرک و نشوونما پاتے کانٹنٹ کے درمیان بقا کی جنگ۔ اور نتیجے میں بقا کس کی ہوگی؟۔ بقا کانٹنٹ کی، نشوونما کی اور ارتقا کی ہوگی۔ کانٹنٹ نشوونما کی بنیاد ہے۔ ارتقا کانٹنٹ کی خمیر میں گندھا ہوا ہوتا ہے۔ فارم بے چارہ تو ہارنے والی جنگ لڑ رہا ہوتا ہے۔

چنانچہ اِس مناقشے میں کاہل، بڈھا اور ''لچک اور اکاموڈیٹ کرنے سے محروم شدہ'' فارم مرجاتا ہے۔ یوں بھرپور نشوونما کرتا کانٹنٹ اپنی نشوونما کی راہ میں اب بنی ہوئی اُس رکاوٹ کو دور کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ فارم اور کانٹنٹ کا اتحاد اضافی اور عبوری ہوتا ہے۔ دور سے، اور بظاہر یک جان و دو قالب نظر آتے اِن دونوں کا یہ اتحاد اِن دونوں کے درمیان تنازعات اور جدوجہد سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔

فارم بذاتِ خود بھی کبھی بھی بنا تبدیلی کے نہیں رہتا۔ فنا کی طرف اس کی تبدیلی جاری رہتی ہے۔ مگر یہ تبدیلی، فارم کو ضائع کر کے پھینک دینے کی طرف یکدم نہیں چل پڑتی۔ یہ تو فارم اور کانٹنٹ کے بیچ تضادات کے بتدریج تیز ہوتے رہنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ مزید برآں کانٹنٹ سے براہِ راست وابستہ ہونے والے بیرونی حالات، فیکٹرز اور کنکشنز بھی فارم کی تبدیلی پہ کچھ اثر ڈالتے ہیں۔

فارم کی آزادی ایک relative آزادی ہوتی ہے۔ آزادی کی یہ اضافیت فارم کے

بوڑھے ہوتے جانے سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔شروع میں فارم کی سٹیبلٹی ایک ایسا فیکٹر ہے جو کانٹنٹ کی بتدریج ڈولپمنٹ کو یقینی بناتا ہے۔مگر وقت گزرنے کے ساتھ اب یہ کانٹنٹ کے لیے سٹیبلٹی نہیں رہتا بلکہ اب یہ ایک بوجھ، ایک جنجال اور سرگردانی بنتا جاتا ہے۔حتیٰ کہ یہ قدیم کے تحفظ کا رکھوالا بن جاتی ہے۔قدیم اور قدامت کا رکھوالا بن جاتا ہے۔کانٹنٹ اور فارم اب ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔

جیسے کہ ذکر ہوا کہ ایک کوالی ٹے ٹو حالت سے دوسرے میں عبور کے اندر پرانا فارم یا تو منسوخ ہوجاتا ہے۔یا وہ اپنی صورت بدل دیتا ہے۔مگر پرانے فارم کو اُس وقت تک منسوخ نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ خود اُس کے اندر ضروری شرائط اور ایک زیادہ بہتر شدہ فارم کی طرف عبور کے لیے عناصر تیار نہ ہوئے ہوں۔یعنی فارم کی یہ موت، اور اُس کے ''اس اخراج'' کا ایک ڈائلیکٹیکل پراسیس ہے جس میں پرانے فارم کو مکمل طور پر ضائع کر کے پھینک نہیں دیا جاتا۔اور نیا فارم بھی یکدم مسلط نہیں ہوتا بلکہ بتدریج غالب آتا جاتا ہے۔

اور کبھی کبھار معاملہ الٹ بھی ہوجاتا ہے۔فارم اور کانٹنٹ کے قانون کے بالکل برعکس۔ چنانچہ دشمنی کے اس کھیل میں کانٹنٹ کے لیے تباہ ہونے والا خدشہ موجود رہتا ہے۔پرانے فارم کی ''بربادی'' کا یہ خدوخال پیچھے جانے کی ڈویلپمنٹ کے لیے امکانات بھی پیدا کرتا ہے ۔یہ پرانے فارم کی بحالی کے لیے امکانات بھی پیدا کرتا ہے۔ہم نے کمیونسٹ سوویت یونین کو دوبارہ کیپٹلسٹ روس بنتے دیکھا ہے۔

فارم اور کانٹنٹ والے اس قانون کا اطلاق سماج پہ بھی ہوتا ہے۔سماج کیا ہے؟۔ یہ پیداوار اور اس سے جڑے ہوئے طبقاتی رشتوں سے بنتا ہے۔یہاں پیداوار اور اُس سے جڑے ہوئے طبقاتی رشتے کانٹنٹ ہیں۔اور سیاست، آرٹ، اور مذہب فارم۔یہ فارم کسی بھی طرح سست اور غیر فعال نہیں ہوتا۔انہی میں اور انہی کے راستے انسانیت کی شعوری زندگی چلتی ہے۔مگر یہ سب کانٹنٹ کے محتاج ہیں۔

سوشل سائنس میں فیوڈلزم پر بھی فارم اور کانٹینٹ کے اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔اگر آلاتِ پیداوار نامی کانٹنٹ ترقی کرتے جائیں گے تو پیداواری رشتے یعنی فارم ایک جگہ تک تو اُن کی مدد کرتے ہیں۔پھر فارم اُن کی یہ مدد جاری نہیں رکھ پاتا، رک جاتا ہے۔اور آخر کار یہ فارم یعنی پیداواری رشتے اپنے کانٹنٹ یعنی پیداواری قوتوں (قوتِ محنت اور آلاتِ پیداوار) کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔تب آلات پیداوار اور قوتِ محنت ترقی کی اپنی صفت کے ہاتھوں مجبور، اپنی ترقی جاری رکھنے کے لیے فارم ہی کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔

بلوچستان میں صدیوں سے فیوڈل نظام قائم ہے۔اور صدیوں ہی سے بھوتار اور راہک پہ مشتمل پیداواری رشتے (فارم) پیداواری قوتوں یعنی آلاتِ محنت اور قوتِ محنت نامی (کانٹنٹ) کی ترقی کو روکے ہوئے ہیں۔مطلب یہ کہ فارم (فیوڈلزم) کافی عرصے سے کانٹینٹ (آلات اور قوتِ محنت) کی نشوونما کا ساتھ نہیں دے سک رہا۔وہ (فیوڈلزم) بوڑھا ہوتا جارہا ہے، اور بلوچستان میں اپنی نشوونما پاتے ہوئے کانٹنٹ (آلاتِ پیداوار، اور قوتِ محنت) کے مزید ارتقا اور نشوونما میں رکاوٹ بن رہا ہے۔کانٹینٹ تو نشوونما کی اپنی خصوصیت ترک نہیں کرسکتا۔اور نشوونما کے نتیجے میں تو وہ ترقی کرتا جاتا ہے۔اب آلاتِ پیداوار اور قوتِ محنت (یعنی کانٹنٹ) کی ترقی نے تو رکنا نہیں لہٰذا لازمی ہے کہ رکاوٹ یعنی فارم، یعنی فیوڈلزم ٹوٹے۔اس کے بغیر سماجی ترقی ممکن ہی نہیں۔

بلوچستان میں حتماً ایک نئے فارم نے وجود میں آنا ہے جو کانٹینٹ کی نشوونما کا کافی عرصہ تک ساتھ دے۔یعنی فیوڈلزم والی فارم نے ٹوٹنا ہے۔ایک نیا فارم قائم ہوگا جسے کیپٹلزم کہیں گے۔مگر کیپٹلزم کا نیا فارم بھی رفتہ رفتہ بے کار ہوتا جائے گا اور پھر وہ بھی برباد ہوکر نئے فارم کو جگہ دے گا۔سوشلزم نامی فارم کو۔

کمیونسٹ پارٹی بھی فارم اور کانٹنٹ کے فارمولا پر چلتی ہے۔پارٹی، اُس کا شعوری لیول، اور اُس کا ڈسپلن فارم ہیں۔''انقلابی تقاضے'' اُس کا کانٹنٹ ہیں۔سماج میں دونوں یعنی فارم

(پارٹی) اور کانٹنٹ (انقلابی رکوائرمنٹ) ضروری ہیں۔۔۔اور انقلابی پارٹی (فارم) خواہ جتنی بھی نعرے بازی کرے، خواہ جتنے اجلے جھنڈے اور بینر لہرائے اور خواہ جتنے میٹھے ترانے گائے مگر ایک بات حتمی ہے۔ وہ یہ کہ پارٹی اپنے کانٹنٹ کی خوشنودی کے لیے کام کرتی رہے گی، خود کو اُس کے ساتھ ہی ایڈجسٹ کرتی رہے گی۔ یہی اُس کی تقدیر ہے۔ پارٹی اول نہیں ہے، اُس کا ڈسپلن اول نہیں ہے، اُس کا شعور اول نہیں ہے۔ اول تو ''انقلابی ضرورت'' ہے۔ پارٹی پابند ہے کہ اسی ضرورت کی مطابقت میں خود کو بدلتی سنوارتی رہے گی۔

قوم اور قومی سوال

'' قومی سوال ''ترقی پذیر کیپٹلسٹ ملکوں کا ایک بہت سنگین معاملہ ہے۔

تاریخ میں قوموں کا معاملہ سب سے سنجیدہ انداز میں انیسویں اور بیسویں صدی میں کھل کر سامنے آیا۔قومیں طبقات سے بہت میں بعد پیدا ہوئیں۔طبقات تو غلامی کے سماج میں پیدا ہو گئے تھے۔مگر غلام داری کے دور تک قومیں وجود میں نہیں آ چکی تھیں۔قومیں بھی اور قومی معاملہ بھی کیپٹلزم میں ابھر کر سامنے آئے۔

قومیں خود بخود نہیں بنتیں۔یہ ایک زبردست ارتقائی پراسیس میں سے گزر کر تشکیل پاتی ہیں۔شروع سے لوگ خون کے رشتوں میں بندھے ہوئے، اور گروہ کی صورت رہتے ہوئے، زمانے کے گرم وسرد سے گزرتے رہے۔جہاں وہ معاشی رشتوں میں بھی بندھے رہے۔پھر کئی خاندان مل کر برادری کی تشکیل کرتے رہے۔ایک طویل پراسیس میں مختلف برادریاں باہم ضم ہوتی رہیں اور'' قبیلہ '' تشکیل دیتی رہیں۔حتی کہ صدیوں کے پراسیس میں یہ سارے قبیلے ایک ایسا بڑا گروہ تشکیل دے گئے جو اب محض خونی رشتوں پہ مبنی نہ تھا۔بلکہ یہ لوگوں کا ایک ایسا بڑا گروہ تھا جو ایک مشترکہ زبان بولتا تھا، جس کا ایک مشترکہ کلچر بن چکا تھا،

جس کے پاس ایک مشترک علاقہ تھا، ایک مشترکہ تاریخ تھی، ایک جیسی نفسیاتی ساخت تھی، اُن کی ایک مشترک مارکیٹ بن گئی۔ یوں اس بڑے گروہ میں خود کو الگ قوم کہلانے کا عوامی ارادہ اور آرزو پیدا ہوا۔

مشترک مارکیٹ کا ہونا بہت اہم ہے۔ مارکیٹ (تجارت) وہاں کے لوگوں کے درمیان روابط بڑھاتی ہے۔ اس سے باہم مضبوط معاشی رشتے بن جاتے ہیں۔ اور یہی نئے رشتے دراصل قوم کو پیدا کرتے ہیں۔ انہی معاشی رشتوں سے ایک جیسی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے منڈی قوم کے اتحاد و پیوستگی کی ضامن ہوتی ہے۔ معاشی زندگی کا اشتراک ایک قوم کی اہم خصوصیت ہوتا ہے۔

نسل اور قوم میں فرق ہوتا ہے۔ نسل ظاہری باتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ رنگ، بالوں، آنکھ، ناک اور سر کی ساخت کے فرق کو نسلی فرق کہا جاتا ہے۔ اور یہ بہت منحوس فرق رہا ہے۔ یاد رہے کہ یورپی گورے نے اپنی نسل کے علاوہ ساری نسلوں کو کمتر انسان کی حیثیت دی اور ان پہ بہت مظالم کیے۔ انہیں قتل کیا، غلام بنایا اور ان سے بدترین حالات میں معدنی کانوں میں مشقت کروائی۔ آج بھی دعووں کے برعکس نسل پرستی سفید فام دنیا میں زوردار طریقے سے موجود ہے۔

دنیا کے اندر بہت سارے ممالک یک قومی ممالک نہیں ہیں۔ بلکہ وہاں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہیں۔ قومی وابستگی بہت سخت جان اور پاورفل جذبہ ہوتا ہے۔ کثیر قومی ریاست میں بالادست قوم خواہ عقیدہ کا سہارا لے، رنگ و نسل کا، زبان کا، یا کسی آفاقی نظریے کا، ایک قوم کسی دوسری قوم میں ضم نہیں ہوتی۔ ایک کثیر القومی ملک میں خواہ کچھ بھی ہو، ایک مشترکہ قوم والا لفظ غیر سائنسی لفظ ہوتا ہے۔

ایک کثیر القومی کپٹلسٹ ریاست میں ہمیشہ زورآور قوم چھوٹی اقوام کا استحصال کرتی رہتی ہے۔ وہ زورآور قوم خود بری طرح ''بگ نیشن شاونزم'' میں مبتلا ہوتی ہے۔ وہ قوم اپنے

ہاتھوں پسماندہ کردہ محکوم قوم کو ''ترقی دینے'' کا فریضہ بھی ازخود سنبھالتی ہے۔ خود غاصب اور استحصالی ہوتے ہوئے وہ محکوم قوم کو ''تہذیب سکھانے'' کا نام نہاد مشن سنبھالتی ہے۔ اور اس بہانے مزید لوٹ مار جاری رکھتی ہے۔ وہ بدترین فسطائیت لاگو کرتی ہے۔ جمہوریت، مساوات اور انصاف سب کچھ اُس کے ''وائسرائے'' کی خوشی و خواہش کا نام بن جاتے ہیں۔

بالادست قوم، محکوم قوم کے اندر اپنے ٹاؤٹ ادیب، ٹاؤٹ پیر، ٹاؤٹ ملا، اور ٹاؤٹ سیاست کار بناتی جاتی ہے۔ اسی کی طرف سے نافذ شدہ میڈیا پالیسی نافذ ہوتی ہے، اپنی مرضی کے لوگوں کو انعام و اکرام اور ایوارڈ و سند عطا کیے جاتے ہیں۔ کون غدار ہے، کون محبِ وطن ہے، کون اہل ہے کون نااہل ہے، کیا پالیسیاں بنانی ہیں، کیسے اُن پالیسیوں پر عمل کرنا ہے، سب وائسرائے کے ہاتھ میں۔ بالادست قوم محکوم اقوام کی زبان، کلچر اور اعتقادات کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

ایک کثیر القومی سرمایہ دارانہ ریاست میں ظالم قوم کی سیاست پر وہاں کے رجعت پرست چھائے ہوتے ہیں، انہی کے خیالات ہر جگہ حاوی ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ، سکولوں، مندروں، بیرکوں اور سینکڑوں ہزاروں اخباروں میں یہی یورش برپا رہتی ہے کہ اُس حاکم قوم کے علاوہ وہاں رہنے والی ساری محکوم قومیں علیحدگی پسند ہیں اور الگ ہونے کی بابت سوچ رہے ہیں۔ بالادست قوم کی اس قوم پرستی کا زہر پورے ملک کے سیاسی ماحول کو زہرآلود بنا رہا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ قوموں کے حقِ خود اختیاری بشمول علیحدگی کے حق کو تعلیم نہ کرنے کے معنی ہیں بدترین موقع پرستی کا شکار ہونا اور مزدور طبقے کو ان کی قوم کے رجعت پرست خیالوں کے زہریلے جراثیم کا شکار بنانا۔

مزدوروں اور اُن کی پارٹی کا فرض ہے کہ وہ مظلوم قوموں کے حقوق بشمول حقِ علیحدگی کی حمایت کریں۔ اس بات کے بغیر قوموں کے درمیان اتحاد قائم ہونے کا سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا۔ ظالم قوم کا جو سوشلسٹ اس قسم کی جدوجہد سے پس وپیش کرتا جاتا ہے۔ تو اُس میں، اس کی نیت میں، یا اُس کی انڈر سینڈنگ میں کوئی کمی ہے، کوئی کھوٹ ہے۔ ایسے شخص یا اشخاص کے قومی مسئلے پر خیالات ویسے ہی ہوں گے، جیسے اُن کی قوم کے سرمایہ داروں کے ہیں۔

قومی سوال کو محض زبانی کلامی تسلیم کرنا کافی نہیں ہے۔ ظالم قوم کے جمہوری انسان اگر اس کے لیے عملی جدوجہد نہیں کرتا تو وہ حقیقت میں مزدور کاز کا خدمتگار نہیں ہے۔ مظلوم قوم کے حقِ خود امتیازی بمع علیحدگی کے حق سے انکار کرنے کا مطلب ہے ظالم قوم کی حد سے زیادہ رجعت پرستوں والی قوم پرستی کے ہاتھوں میں کھلونا بن جانا۔

قوموں کے حقوق کو رد کرنے کے معنی ہوں گے کہ طاقتور اور بالا دست قوم جو خاص مراعات ہڑپ کر کے بیٹھی ہے اور پولیس راج کے انتظامی طریقے استعمال کرتی ہے ان کا دفاع اور وکالت کرنا۔ بڑی قوم کے جمہوری انسان کو بہرصورت 1920 میں منعقد شدہ تیسری انٹرنیشنل کی کانگریس کے منظور کردہ اس نعرے کو اپنانا ہوگا: دنیا بھر کے مزدور اور دنیا کی مظلوم قومیں متحد ہو کر ایک ہو جاؤ!۔

اسی طرح جو لوگ قومی حقوق کے نام پر پرولتاری بین الاقومیت کو پاؤں تلے روندتے ہیں وہ دنیا کے تنگ نظر ترین لوگ ہوتے ہیں۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ پرولتاری بین الاقوامیت اور قومی مفادات میں مناسبت لازم ہے۔ حقیقی وطن دوستی بین الاقوامی پہلو رکھتی ہے۔ اور بین الاقوامیت پسند لوگ سخت وطن دوست ہوتے ہیں۔ مزدور پارٹی کی قومی اور بین الاقوامی ذمہ داریاں ایک دوسرے کے ساتھ جدا نہ ہونے والی ہیں۔ اور مزدور پارٹی جس طرح اپنے ملک کے مزدوروں اور عوام کو جوابدہ ہے، اسی طرح وہ عالمی مزدور طبقے کو بھی جوابدہ ہے۔ مارکسسٹ لیننسٹ اگر تنگ نظر قوم پرستی کے بھی خلاف ہیں، تو وہ اتنی ہی شدت کے ساتھ طاقتور قوم کی

طرف سے دوسری قوموں پر تسلط پسندی کو بھی مسترد کرتے ہیں۔

دور کیوں جائیے۔ خود اپنی تاریخ دیکھیے۔ یہاں بالا دست قوم کے حاکم طبقات کی طرف سے قومی یک جہتی کے نام سے سارے وسائل کا دھارا اپنی طرف موڑتے ہوئے چھوٹی اقوام کو محض طفل تسلیاں دی جاتی ہیں۔ بدترین قسم کا ون یونٹ قائم کیا جاتا ہے۔ چھوٹی اقوام کی تاریخ مسخ کی جاتی ہے، اُس کے ہیروؤں کی تعظیم کے الٹ اقدام کیے جاتے ہیں اور بدترین سنسر شپ نافذ کی جاتی ہے۔

یہی زور آور قوم محکوم قوم کے اندر سے اپنے سہولت کاروں میں سے اسمبلی ممبر، کابینہ اور چیف منسٹر، گورنر اور سپیکر کو سلیکٹ کرتی ہے۔

حاکم قوم کی لوٹ مار کے ساتھ ساتھ محکوم کو ایک اور بلا کا بھی سامنا ہے۔ وہ ہے: اس کا اپنا سردار، وڈیرہ، جاگیردار، ملّا، میر اور پیر۔ یہ طبقہ بیرونی ظالم قوم سے بچی کھچی ''دولت'' اپنی قوم سے چھین لیتا ہے۔ لہذا ہر محکوم قوم کے انقلابی کو بہ یک وقت دو طاقتوں کے خلاف جدوجہد کرنی ہوتی ہے: بیرونی قوم کے استحصال کے خلاف، اور اپنی قوم کے بالائی طبقے کے خلاف۔ ان دونوں دشمنوں میں نمبر 1 اور نمبر 2 نہیں ہوتے۔ دونوں کے خلاف یکساں جوش وہوش کے ساتھ جدوجہد کرنا ہوتا ہے۔

محکوم قوم کا بورژوازی اور اُس کا ٹاؤٹ دانشور جو چاہے کہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آزادی کا ایک نہیں دو مطلب ہیں: ظالم قوم سے آزادی بھی، اور، اپنے فیوڈلزم سے آزادی بھی۔ مگر محکوم قوم کی بورژوازی اور پیٹی بورژوازی فیوڈلزم کا خاتمہ نہیں چاہتی۔ وہ لوگوں کو صرف بڑی قوم سے نجات پہ اکساتی ہے۔ جب کہ اصل کام تو حاکم قوم سے اپنے قومی حقوق کے لیے سخت جدوجہد بھی کرنا ہے اور ساتھ میں فیوڈلزم کا خاتمہ بھی کرنا ہے۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ محکوم اقوام کے اندر ہر نیشنلسٹ کمیونسٹ نہیں ہوتا مگر وہاں ہر کمیونسٹ کے لیے (شاونزم کی ہر شکل سے پاک) نیشنلسٹ ہونا لازمی ہے۔ کمیونسٹ بغیر شرائط، بغیر اگر مگر، اور بغیر حیل وحجت کے قوموں کی حق خود اختیاری بشمول حقِ علیحدگی کی

حمایت کرتا ہے۔ کمیونسٹ قومی سوال کو انقلابی تحریک کے اندر طبقاتی سوال کے جڑواں حیثیت میں بنیادی معاملہ گردانتا ہے۔ وہ ہمیشہ اسے ورکنگ کلاس معاملے کے ساتھ ملا کر رکھتا ہے، اسے بین الاقوامی مزدور تحریک، اور سماجی ترقی کی جدوجہد کے ساتھ ملا کر رکھتا ہے۔ وہ یہ تو سمجھتا ہے کہ قومی مسئلے کا کپٹلزم کے اندر رہ کر کوئی حل موجود ہی نہیں ہے۔۔۔۔۔ مگر وہ اس بات سے متفق نہیں ہوتا کہ جب تک سوشلزم نہ آئے تب تک قومی سوال کو ملتوی رکھا جائے۔ چنانچہ پس ماندہ معاشروں میں مجرد طبقاتی سوال یا مجرد قومی سوال نہیں ہوتا۔ یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ انہیں علیحدہ کرنا خیانت ہے۔

کمیونسٹ قومی مساوات اور سیاسی آزادی کا سب سے زیادہ پر جوش علمبردار ہوتا ہے۔ وہ سماجی ترقی میں رکاوٹ ڈالنے والی رجعت پرست قوتوں کے خلاف لڑتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ بورژوا قومی آزادی کی تحریک نہ تو پرولتاری ہوتی ہے اور نہ سوشلسٹ۔ نہ ہی اس کا مقصد کپٹلزم کا خاتمہ اور سوشلزم کا قیام ہے۔ چنانچہ اس تحریک کی اہمیت میں مبالغہ آرائی نہ ہو اور نہ ہی اسے اصل انقلابی قوت سمجھا جائے۔ لیکن وہ خود اپنے پروگرام میں قوموں کی حقِ خوداختیاری کو لازمی نکتے کے بطور شامل رکھتا ہے۔ کمیونسٹ قومی سوال کا مالک ہوتا ہے، محض حامی نہیں ہوتا۔ اسے ہی لیڈ کرنا ہوتا ہے اس تضاد کو۔ وہ کسی اور کو قومی مسئلے کا سجادہ نشین، ایجنسی ہولڈر اور مالک سمجھتا ہی نہیں۔

ریاست

سٹیٹ ،اتھارٹی کی ایک تنظیم ہے ۔ یہ سماج کی طبقاتی تقسیم سے وابستہ ہے ۔سٹیٹ معاشی طور پر حاوی طبقے کی سیاسی تنظیم ہے۔ یہ اُس طبقے کے ہاتھ میں جبر کا، ڈنڈے کا، جیل و پھانسی کا ایک آلہ ہوتا ہے جس کو یہ طبقہ محکوم طبقے کے خلاف استعمال کرتا ہے۔اس میں فوج، پولیس، عدالتیں، جیلیں میڈیا سب شامل ہوتی ہیں۔

ہر ریاست نظریاتی ریاست ہوتی ہے۔ یہ ریاستی نظریہ کبھی سیاسی ہوتا ہے، کبھی اقتصادی اور کبھی مذہبی۔اس کے ذریعے ریاست کے باشندوں کو اطاعت کا ''خوگر'' بنایا جاتا ہے۔ان کے دل و دماغ کو ریاست کے اغراض و مقاصد کے مطابق ڈھالا جاتا ہے اور یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ ان کا اور ریاست کا مفاد مشترک ہے، حالانکہ حقیقت میں ریاست ایک طبقاتی ادارہ ہے، جس کا بنیادی مقصد برسر اقتدار طبقے کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ریاست حکمرانوں کے طبقے کے ہاتھ کا ہتھیار ہے جس سے وہ غیر حکمران طبقات کو زیر کرتا ہے۔ ریاست سرداروں، خانوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور اِن سب کے مرشد (امریکہ) کے مفادات کی چوکیدار ہوتی ہے۔ ریاست کے ستون یعنی عدالت، فوج، اسمبلی اور میڈیا انہی طبقات کی خدمتگزاری کرتے ہیں۔

اس ریاست کی صورت کہیں بادشاہت والی ہوتی ہے، کہیں مارشل لا والی، اور، کہیں وہ جمہوری ریاست کی صورت میں ہوتی ہے۔

سٹیٹ سماج کی اپنی پیداوار ہے۔ یہ باہر سے مسلط نہیں ہوتا۔ یہ کھمبی کی طرح اچانک بھی زمین سے نہیں اگتا۔ یہ تو سماجی ارتقا کی ایک خاص منزل پہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مسلسل تاریخ رکھتا ہے۔ یہ شروع سے موجود نہ تھا اور نہ یہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ موجود نہ تھا اس لیے کہ پرانے زمانوں میں خونی رشتوں پہ مشتمل سماج ہوا کرتا تھا۔ زبان و عقیدہ اور اٹھک بیٹھک ایک جیسی ہوا کرتی تھی۔ انسان بستیاں بسانے سے قبل کسی علاقے یا سرحد تک محدود نہ تھا۔ بارشوں کا پیچھا کرتے ہوئے، یا شدید موسموں کے عذاب سے بچنے کے لیے کبھی یہاں کبھی وہاں پڑاؤ ڈالا جاتا تھا۔ وہاں خونی رشتوں کی یہ آبادی طبقات میں بٹی ہوئی نہ تھی۔ اِسی لیے حاکم محکوم والا معاملہ نہ تھا۔اسی لیے پولیس و جیل موجود نہ تھا۔

جوں جوں سماج ترقی کرتا گیا۔تو طبقات وجود میں آ گئے ۔کوئی امیر بنتا بنتا بالا دست بن گیا اور بقیہ آبادی درجے میں گرتی گئی۔ بالا دست زمین، چراگاہ، پانی اور مویشی پہ قابض ہوتا گیا اور بقیہ آبادی ان سب سے محروم ہوتی گئی۔ مطلب یہ کہ جب سردار، خان، جاگیردار موجود نہ تھے تو ریاست تھی ہی نہیں۔ ریاست اُس وقت پیدا ہوئی جب انسان اپنی ضرورت سے زیادہ پیداوار کرنے لگا۔تب زور آور اور مکار شخص نے پیداوار کے سرچشمے کو ہتھیا لیا۔اسے برقرار رکھنے کے لیے اسے گارڈ کی ضرورت پڑی۔یعنی اب بالا دست، یا امیر یا جائیداد و ملکیت والے طبقے کو اپنی بالا دستی قائم کرنے کے لیے طاقت کی ضرورت پڑی ۔تب پولیس یا لیویز وجود میں آئی۔ اپنی جائیداد کی حفاظت کے لیے باغی کو جیل میں بند کرنے کے لیے جیل خانے بنانے پڑے۔اپنے حق میں فتوے دینے کے لیے اس نے پنڈت پادری کے ادارے ایجاد کیے۔ شاعر سے اپنے حق میں گیت کہلوائے اور اپنے لیے فیصلے لینے کے لیے کرایہ دے کر طرفدار جرگہ یعنی عدلیہ تشکیل دیا۔اور ایک ایک کر کے دوسرے ادارے بنانے پڑے ۔ اِن سب ناجائز اداروں کے مجموعے کو ''سٹیٹ'' کہا جاتا ہے۔یوں پراسراریت میں لپٹا ہوا ایک دیوتا نما سردار اور بادشاہ کا سٹیٹ چل پڑا۔

دوسرے لفظوں میں، سٹیٹ طبقات کی پیداوار ہے۔اس کا کام ہی یہ ہے کہ یہ حاکم طبقہ کی بالا دستی کو قائم و دائم اور بچائے رکھے ۔حکمران طبقہ خواہ بادشاہ ہو، تھیوکریسی ہو، جاگیردار ہو، کیپٹلسٹ ہو یا سوشلسٹ، سٹیٹ اُس کی خدمت کرے گا۔: یعنی حکمران طبقہ کی خدمت۔سٹیٹ طبقاتی اداروں کا کُل ہوتا ہے۔سٹیٹ طبقاتی ہوتا ہے۔

سٹیٹ اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ سماج خود اپنے ناقابلِ حل تضاد میں پھنس گیا ہے۔ جسے وہ خود دور نہیں کر سکتا۔یعنی طبقات میں مصالحت ممکن نہیں رہتی تب ریاست پیدا ہوتی ہے۔

ریاست سارے سماج کی مستند نمائندہ تھی۔ یہ ایک مجموعہ کی شکل میں اس کا ''نظر آنے والا '' اظہار تھی۔ لیکن اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ ریاست اس طبقے کی تھی، جو اس عہد میں سارے سماج کی نمائندگی کر رہا تھا۔ عہد قدیم میں ریاست غلاموں کے مالکوں کی تھی۔ سرداری نظام میں ریاست سرداری ہوتی ہے، جاگیرداری میں بادشاہت اور کپٹلزم میں ریپبلک۔

سماج ارتقا کرتا گیا تو ریاست بھی جدید بنتی گئی۔ مگر اُس کی بنیادی ڈیوٹی نہیں بدلی۔ آج جدید کپٹلزم میں عام جرگہ کی جگہ فل فلیجڈ جوڈیشری سامنے آئی۔ ایک ڈھیلے ڈھالے قبائلی لشکر کی جگہ سٹینڈنگ آرمی کھڑی کر دی گئی۔ پارلیمنٹ بنی۔ اخبار اور ریڈیو سے بڑھتے بڑھتے میڈیا نے ٹی وی چینل اور سوشل میڈیا کی صورت ارتقا کیا۔۔۔۔ اور یہ سب (یعنی ریاست) کپٹلزم کی خدمتگزاری کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اب پارلیمنٹ سرمایہ داروں کی حکومت کی مالک نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس حکومت پارلیمنٹ کی مالک اور آقا ہے۔ دراصل اگر فاشزم بورژوازی کا ٹیررسٹی ڈکٹیٹرشپ ہے، تو پارلیمانی ڈیموکریسی اس کی بھیس بدلی ڈکٹیٹرشپ ہے۔

ریاست کی طرف سے کپٹلزم کی اِس خدمتگزاری کا مطلب ہے: مخالف طبقات یعنی کسانوں مزدوروں اور دانشوروں کو دبانا، اور اُن کی تحریک کو کچلنا۔

آج کی ماڈرن ریاست مناپولیز کے مفاد میں معیشت کو کنٹرول اور ریگولیٹ کرتی ہے۔ اس طرح کر کے ریاست نہ صرف مناپولیز کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ نہ صرف خود اپنے سرمایہ (کپٹل) کو اپنے فائدے کے لیے موڑ دیں، بلکہ وہ انہیں ریاستی خزانے کو بھی استعمال کرنے کا موقع دیتی ہے جو کہ آبادی پر ٹیکس لگا لگا کر بھرتا جاتا ہے۔ گویا ماڈرن ریاست سُو پر منافعوں کو پمپ کرنے کی ایک مشین ہے۔

ریاست ہر چیز کو سرمایہ داروں اور اشرافیہ کی نظر سے دیکھتی ہے، وہ انہی پر عنایتیں برساتی ہے اور انہیں ہی سارے حقوق عطا کرتی ہے۔ وہ ملک کا انتظام اُن کے حوالے رکھتی ہے اور اُن مزدوروں کو فسادی قرار دیتی ہے جو اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ سٹیٹ یہ بیان کرتا ہے کہ وہ فیکٹری مالکان اور مزدور دونوں کی بہبود کو مساوی طور پر اپنے دل کے قریب رکھتا ہے، مگر اندھے کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ وہ خالی خولی الفاظ ہیں۔

اس لیے ریاست عام آدمی کے لیے ماں نہیں ہوتی۔ یہ صرف اور صرف بالائی طبقات کے لیے ماں ہوتی ہے۔ عوام کے لیے، نچلے محکوم طبقہ کے لیے تو یہ ڈائن ہوتی ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ریاست اور قوم کی سرحدیں ایک ہوں۔ مثلاً جرمن قوم دیر تک دو آزاد ریاستوں میں بٹی رہی۔ یہی حال ویت نام کا رہا۔

ریاست کے حدود اربع گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ مثلاً آج ہندوستان کی سرحدیں وہ نہیں جو 1947 سے پہلے تھیں۔ پاکستان کی سرحدیں آج وہ نہیں ہیں جو 14 اگست 1947 کو تھیں۔ مگر سرحدوں کے برعکس قوموں اور تہذیبوں کے حدود بہت مشکل سے بدلتے ہیں۔

بعض ریاستوں میں ایک ہی قوم آباد ہوتی ہے۔ جیسے جاپان میں جاپانی قوم، اٹلی میں اٹالین قوم اور فرانس میں فرنچ قوم۔ ایسی ریاستوں کو قومی ریاست کہا جاتا ہے۔ لیکن بعض ریاستوں میں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہوتی ہیں جیسے کینیڈا میں برطانوی اور فرانسیسی قومیتیں۔ پاکستان میں بلوچ پشتون سندھی پنجابی وغیرہ قومیں۔

جدید ریاست ایک افسر شاہانہ درندہ ہے جو محنت کش طبقے کی پیدا کردہ دولت کے بہت بڑے حصے کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ سٹیٹ استحصال کا ایک ناترس آلہ ہے۔

محنت کش اس جدوجہد میں ہوتے ہیں کہ ریاست کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ مقصد نجی ملکیت کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے۔ محنت کش بورژوازی کو نکال کر اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔

انارکسٹ کہتے ہیں کہ سٹیٹ کو کچھ نہ کہا جائے کیونکہ یہ ایک فضول ایجاد اور بیکار آلہ ہے۔ ہمارا اِس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک ناپاک شئے ہے اس لیے اسے ہاتھ نہ لگایا جائے۔ بورژوازی کہتی ہے یہ مقدس ہے اس لیے اسے ہاتھ نہ لگایا جائے۔ دونوں کہتے ہیں کہ اسے نہ چھوا جائے۔

مگر انقلابی کہتے ہیں کہ اُس کو نہ صرف چھوا جائے بلکہ اسے اپنے ہاتھوں میں لیا جائے، اس پہ قبضہ کیا جائے۔ اسے اپنے طبقاتی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے تاکہ نجی ملکیت کا خاتمہ کیا جا سکے اور محنت کش طبقہ اپنی نجات کرے۔

محنت کشوں کا سیاسی اقتدار۔۔۔ موجودہ بورژوا ریاست کے برعکس ایک زیادہ جمہوری

سٹیٹ قائم کرتا ہے:

1۔ واپس بلائے جانے کا حق عوام کو دے کر تمام افسروں کو آزادانہ انتخابات کے ذریعے منتخب کیا جائے۔

2۔ایک ہنرمند مزدور سے کسی بھی افسر کی اجرت زیادہ نہ ہو۔

3۔ مسلح عوامی ملیشیا فوج کی جگہ لے لے۔

اس لیے پرولتاریہ کا سٹیٹ دراصل سٹیٹ نہیں ہوتا۔ بلکہ نیم سٹیٹ ہوتا ہے۔اس لیے کہ بورژوا سٹیٹ تو عوام سے خود کو بیگانہ کرتی جاتی ہے،عوام کی مخالفت کرتی ہے اور عوام کو بالادست طبقہ کے نیچے رکھتی ہے۔مگر پرولتاریہ والی سٹیٹ حتمی طور پر عوام کے مفادات کا اظہار کرتی ہے۔ یہ نیم ریاست ہوتی ہے۔ یہ ریاست مستقبل میں کمیونسٹ ریپبلک (خودانتظامیہ) کے لیے جگہ خالی کرتی جائے گی۔حتی کہ یہ بطورِ ریاست اپنا وجود کھودے گی۔

یعنی آخر کار جب ریاست سچ مچ پورے سماج کی نمائندہ بنتی ہے،تو اُس وقت اُس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔کوئی ایسا طبقہ ہی باقی نہیں رہتا،جس کو محکوم بنا کر رکھا جائے۔طبقاتی تسلط اور انفرادی زندگی کی بقاء کی جدوجہد جو پیداوار کی طوائف الملو کی پر مبنی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے جھگڑے اور تصادم اور زیادتیاں سب ختم ہوجاتی ہیں۔کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جس پر جبر کیا جائے۔اور اس لیے ریاست بطور جبری قوت آخری کام یہ کرتی ہے کہ سماج کے نام پر تمام ذرائع پیداوار پر قبضہ کرتی ہے۔ ریاست کی حیثیت سے یہی اس کی آخری خدمت ہے۔

اب سماجی تعلقات میں ریاست کی مداخلت غیر ضروری ہوتی ہے،اور بالآخر یہ ختم ہوجاتی ہے۔ البتہ،ریاست کا یکا یک 'خاتمہ'' نہیں ہوتا اس کا پودا رفتہ رفتہ خود سوکھتا جاتا ہے۔

مزدور طبقہ ریاست سے جتنے دن بھی کام لیتا ہے، وہ آزادی کی خاطر نہیں بلکہ اپنے دشمنوں کا سر کچلنے کا کام ہوتا ہے اور جونہی آزادی کا امکان پیدا ہوجاتا ہے،ریاست کی حیثیت سے ریاست کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

یہ زمانہ ترقی یافتہ کمیونزم کا ہوگا۔وہاں ریاست صرف اس وقت بکھر جانے کے قابل ہوتی ہے جب عوام الناس بنیادی اصولوں پر چلنے کے عادی ہوجائیں اور وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کر رہے ہوں اور پیداوار کی تقسیم اُن کی ضرورتوں کے مطابق ہورہی ہو۔

قانونِ فطرت پر یقین رکھنے کا مطلب کائنات کے قابلِ ادراک ہونے پر یقین رکھنا ہے۔

کائنات کی تاریخ میں چار پانچ واقعات انتہائی اہم تھے۔اُن واقعات نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔

اول: بظاہر بے جان مَیٹر کے ارتقا میں جاندار تک آجانا ایک معراج تھی۔

دو: اور پھر جانداروں کے ارتقا کی آخری اور قطعی جہت انسان کا وجود میں آجانا۔

تین: انسان کا دو پاؤں پر کھڑا ہونا اور ہاتھوں کا آزاد ہو جانا ایک اور ترقی تھی۔

چار: اور پھر دونوں ہاتھوں کا عجیب ترین ہونا تو کمال کا ارتقا تھا۔انہی ہاتھوں کی انگلیوں کی فنکاری نے پھر دماغ کو ماہر، اور استاد بنالیا۔ہاتھ کی انگلیوں کی پیچیدہ ترین صلاحیتوں، ہاتھ کے پنجے کی موومنٹ کی بہت طرفہ سمتیں، اور کہنی اور کندھے سے بازو کی ہمہ سمت مڑ سکنے کی صلاحیت نے انسانی دماغ کو بہت کچھ دیا۔آج بھی اگر انسان کے ہاتھوں کی صلاحیتیں بکری کی اگلی ٹانگوں جیسی ہو جائیں تو دس دماغ بھی اکٹھا کر لیں تب بھی انسان انسانیت کا عروج تو کیا اپنا منہ تک نہ دھو سکے۔

پانچ: انسان میں دماغ کے مرحلے تک پہنچنا بلندیوں کی بھی بلندی تھی۔

دوسری بات یہ بھی طے ہو چکی ہے کہ مَیٹر بنیادی ہے اور شعور سے آزادانہ اپنا وجود رکھتا ہے۔ازل سے موجود میٹر سے ہی چند لاکھ برس قبل انسان اور دوسرے جانداروں اور مظاہر کا وجود ہوا۔پہاڑ دریا اور دشت انسان سے ملینوں سال پہلے سے موجود رہے، انسان تو بہت بعد میں آیا۔

کاسموس کی عمر 14 بلین سال ہے۔جبکہ زمین کی عمر 4.6 بلین سال ہے۔کائنات میں

زندگی نے تو بہت دیر بعد جنم لیا ہے۔اور انسان، وہ تو بہت بعد میں آیا۔انسان محض سات ملین سال کا ہے۔اور اس کے اندر کا برین تو بہت عرصہ بعد ڈویلپ ہوا۔(یعنی کا سموس) انسان سے کم از کم تیرہ بلین سال پہلے سے موجود تھا اور زمین ہم سے چار بلین سال سینئر ہے۔اور یوں مَیٹر انسان اور اُس کے ذہن کا باپ ہے۔اور انسانی ذہن میٹر کا بیٹا۔ بیٹا تو والد سے بڑا نہیں ہوتا ناں!۔لہذا ہم اور ہمارا شعور میٹر سے بہت بعد میں آئے ہیں۔

شعور (Consciousness) اپنی ذات اور اپنے اردگرد موجود دنیا کے بارے میں جاننے کو کہتے ہیں۔مغز اور وہاں پیدا شدہ شعور اِسی مَیٹر ہی سے ڈویلپ ہوئے۔اسی پہلے سے موجود میٹر سے انسان بنا، اور اسی پہلے سے موجود میٹر سے انسانی برین بنا۔ جو کہ غور فکر کرنے کی ایک مہان فیکٹری ہے۔

شعور صرف اور صرف انسانی برین کا کام ہے۔کائنات میں کسی اور چیز میں یہ اہلیت نہیں ہے۔ حتی کہ انسان کے اندر بھی دماغ کے علاوہ کسی اور عضو میں یا کسی اور سیل میں شعور نہیں ہے۔منصوبہ، نصب العین، مقصد سب انسانی برین کے کام ہیں۔گدھے کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔چلتن پہاڑ کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔بیجی اور ہنگول کے مقدس دریاؤں کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔سمندر کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔نصب العین، مقصد، اور نظریہ صرف انسان کا ہوتا ہے۔اور انسان محض سات ملین سال سے اِس 14 بلین برس بوڑھے کائنات میں آیا ہے۔اس لیے شعور، منصوبہ، نصب العین بھی انسانی برین کے ڈویلپ ہونے کے بھی بعد آئے۔یوں میٹر یعنی برین شعور کو بناتا ہے نہ کہ شعور سے میٹر بنتا ہے۔شعور اور آئیڈیا مَیٹر ہی سے وجود میں آتے ہیں۔

چونکہ مغز میں سے آئیڈیا اور شعور نکلتے ہیں تو اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ شعور اور آئیڈیاز بھی میٹر ہیں، آواز وصدا بھی۔ارے بھئی عشق ومحبت بھی میٹر ہیں۔جس چیز کو ہم خیال یا روح کہتے ہیں وہ دراصل انسان کے مغز ہی کا عمل ہے۔مغز سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

شعور کے نمودار ہونے کے بعد انسانوں اور جانوروں کے درمیان فیصلہ کن فرق پیدا ہوگیا۔

***

آپ سمجھیے کہ ہم ایک نوزائیدہ بچے کے مغز پہ بات کر رہے ہیں۔مغز ایک زبردست آرگن ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ شروع شروع میں کورا کاغذ ہے۔یہ استعمال سے نشوونما پاتا ہے۔بچہ شروع دن ہی سے آس پاس کی دنیا سے interact کرتا ہے، مشاہدہ کرتا ہے اور چیزوں پہ کام کرتا ہے۔ پیدائش کے وقت اس کا محض برین سٹیم اور سپائنل کارڈ ڈویلپ شدہ ہوتا ہے۔جس سے وہ محض، سونا، کِلنگ، rooting اور فیڈنگ کرسکتا ہے۔اس مغز میں دوسرا کوئی پروگرام فیڈ نہیں ہے۔ اس نوزائیدہ کے شعور تک پہنچنے کے پراسیس میں مندرجہ ذیل اعضا اور اقدامات آتے ہیں:

1۔حواس خمسہ

ہم یہ تو جانتے ہیں کہ بچہ اس دنیا میں عظیم ترین learning مشین ہے۔سوال یہ ہے کہ نوزائیدہ بچے کا کورا کاغذ یعنی مغز یا ہارڈ ڈسک پروگرامڈ کیسے ہوتا ہے؟۔جواب یہ ہے کہ اس کے جسم میں بالخصوص انگلیوں بھرے دو ہاتھ، دو کان، دو آنکھیں، دو نتھنے اور جسم کا سب سے وسیع وعریض عضو یعنی جلد موجود ہوتے ہیں۔جو کہ ہمہ وقت اور ہمہ حالت حیرانگی کے ساتھ سرگرم طور پر بیرونی دنیا کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

یہ اعضا اپنے اپنے مشاہدات مغز کے خالی مگر بہت بڑے ہارڈ ڈسک میں ڈالتے جاتے ہیں۔یعنی درد، جلن، ٹھنڈک، گرمائش، نرمی سختی، خوشبو بدبو، اور آنکھ سے دیکھی ساری چیزیں ہارڈ ڈسک میں بھرتی ہوجاتی ہیں۔اِن مشاہدات کو ہم ''حسیاتی علم'' یا (Perceptual knowledge) کا نام دیتے ہیں۔یعنی وہ علم جو senses یا حواس سے percieve کیا جاتا ہے۔یہ کام اشیا کو جاننے یعنی علم کی پہلی سطح ہے۔

آپ تصور کریں کہ اگر جلد، ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک اور کان موجود نہ ہوں یا فنکشن نہ کریں تو مغز کا ہارڈ ڈسک تو خالی رہے گا۔اس صورت میں اسے مغز تو نہیں کہا جاسکتا۔چنانچہ مغز

اکیلا کچھ نہیں۔ وہ اپنے ساتھ ایسے آلات رکھتا ہے جو بیرونی دنیا کی معلومات اُس تک پہنچاتے ہیں۔ یہ آلات ہمارے حواس ہیں۔ مغز، حسیات کے دریچوں سے دیکھنے پر مجبور ہے۔

جو شخص اپنی آنکھیں بند کرے، اپنے کان میں پنبہ ٹھونس دے اور خود کو معروضی دنیا سے مکمل طور پر کاٹ دے تو اس کے پاس علم نام کی کوئی چیز نہ ہوگی۔ علم تو تجربے (عمل) سے شروع ہوتا ہے۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ یہ اعضا رکتے نہیں، آرام نہیں کرتے۔ بلکہ ساری عمر اپنے حاکم یعنی برین کو پیغامات بھیجتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سارے اعضا موجود ہوں مگر حرکت نہ کریں تب بھی کوئی سگنل برین کے ہارڈ ڈسک کی طرف نہیں جائے گا۔

لہذا سارا علم انسان کے سینس آرگنز کے ذریعے معروضی بیرونی دنیا کے احساس سے شروع ہوتا ہے۔

لیکن اگر ہارڈ ڈسک کو فیڈ کرنے کے بعد برین کے یہ اہلکار اعضا، بے کار ہو جائیں تب بھی برین کام نہیں کرتا۔ وجہ یہ ہے کہ برین کو چیزوں کو پراسیس کرنے کے لیے نئی نئی انفارمیشن کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئی حسیاتی انفارمیشن، یا چیلنج، یا ٹاسک نہ ملے تو ہارڈ ڈسک میں سٹور پروگرام بیکار پڑا رہتا ہے۔ کسی چیز کو جاننے کے لیے اس کے ساتھ رابطے میں رہنا ضروری ہے، اس کو پریکٹس کرنا ضروری ہے۔ کچے خربوزے کا ذائقہ جاننے کے لیے کچے خربوزے کا چکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر پکے خربوزے کا ذائقہ جاننے کے لیے کچے خربوز کے ذائقہ کا علم کام نہیں دے گا۔ اس کے لیے آپ کو پکے خربوزے کا ذائقہ چکھنا ہوگا۔ فیوڈلزم کے اندر رہتے ہوئے آپ فیوڈلزم ہی کے قوانین کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ مگر اُس فیوڈلزم کے اندر رہتے ہوئے ایڈوانس میں کپٹلسٹ سماج کے قوانین جاننا ناممکن ہے۔ مارکس کے زمانے میں امپیریلزم یعنی سامراج نہ تھا۔ اس لیے وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ لینن کے زمانے میں ظہور پذیر ہوا، اس لیے لینن ہی نے امپیریلزم کے قوانین جانے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ علم کو زیادہ گہرا ہوتے رہنا چاہیے ۔ یعنی علم کے ادراکی

Perceptual مرحلے کو استدلالی rational علم تک بڑھوتری کرتے رہنا چاہیے۔

ایک چیز پہ اس کی مجموعیت میں غور کرنے، اس کے جوہر (essence) پہ غور کرنے، اس کے موروثی قوانین کو پہ غور کرنے کے لیے، احساسِ ادراک (Sense of perception) کے امیر اعداد و شمار کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کے لیے ایکسر سائز کے ذریعے، کچرہ کو ضائع کرنے اور لازم کو چننے کے لیے، باطل کو ختم کرنے اور سچ کو برقرار رکھنے کے لیے، ۔۔۔۔۔ ادراکی (Percetional) سے استدلالی (Rational) علم کی طرف ایک چھلانگ لگانا لازم ہے۔

لہذا علم کے پراسیس میں پہلا قدم بیرونی دنیا کی چیزوں سے ڈائریکٹ رابطہ رکھنا ہے۔ یہ درک اور ادراک یعنی perception کا مرحلہ ہوتا ہے ۔ دوسرا قدم اِس ادراک (perception) کے ڈیٹا کو ترتیب دیکر اور دوبارہ کنسٹرکٹ کر کے SYNTHESIZE کرنا ہے۔

استدلالی (Rational) علم، ادراکی (Perceptual) علم پر انحصار کرتا ہے۔ اور ادراکی (Perceptual) علم کو استدلالی (Retional) میں ترقی کرنا ہے۔

2۔ بھیجا، دماغ یا مغز (برین)

اب آجایئے برین یعنی مغز کی طرف۔ برین (مغز) پورے جسم کے وزن کا محض دو فیصد ہے مگر یہ جسم کے کُل آکسیجن کا 20 فیصد خرچ کرتا ہے۔ اور شیر خوار بچوں میں تو یہ شرح 50 فیصد تک ہوتی ہے۔ دوسرا کمال دیکھیے کہ جسم کے گلوکوز کا 20 فیصد صرف مغز استعمال کرتا ہے۔

موٹے الفاظ میں برین شعور، تصورات اور خیالات سے متعلق آلہ ہے۔

برین کے کام درجِ ذیل ہیں:

1۔ انفارمیشن جمع کرنا تو اُس کا سب سے اہم کام ہے۔

2۔ دوسرا بڑا کام حسیاتی آرگنز سے آمدہ انفارمیشن کو سٹور کرتے رہنے کا ہے۔

3۔پھر تیسرا کام وہ یہ کرتا ہے کہ اس ساری انفارمیشن کی فائلیں بناتا جاتا ہے۔فولڈرز بناتا جاتا ہے۔اورانہیں ترتیب دیتا ہے۔

4۔صرف یہ نہیں بلکہ چوتھا کام وہ یہ کرتا ہے کہ ضرورت کے وقت اِن فائلوں،فولڈروں کوفوری کھولنے کا پکا انتظام کرتا رہتا ہے۔

5۔یہ چاروں ہم آہنگ اور ہم بستہ کام وہ دراصل دو دیگر فرائض کی بجا آوری کے لیے کرتا ہے۔

پہلا (یعنی پانچواں) تو یہ ہے کہ وہ کسی بھی ٹاسک یا فریضہ یا ضرورت کے لیے سارے حسیاتی علم کی مدد لے کر پراسیسنگ کا زبردست اور پیچیدہ کام کرتا ہے۔برین پراسیسنگ کا دنیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔

6۔دوسرا (یعنی چھٹا اور آخری) کام وہ یہ کرتا ہے کہ پراسسنگ کے بعد انسان سے جو کام کروانا ہے اُس کا جامع اور کلیئر کٹ حکم دیتا ہے۔مطلب یہ کہ انسان صرف خارجی اشیا کا علم ہی حاصل نہیں کرتا بلکہ اپنے عمل سے خارجی دنیا پر اثر انداز بھی ہوتا ہے،اُسے بدلتا بھی ہے۔

کمال یہ ہے کہ حکم یا آرڈر کا پیغام لے جانے والے آلات وہی ہوتے ہیں جو اُس کے انفارمر یا جاسوس بھی ہیں۔جیسے کہ یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ممالک کی انٹلی جنس ایجنسیاں جاسوسی کرتی ہیں۔مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ صرف جاسوسی نہیں کرتیں بلکہ عملی کاروائیاں بھی وہی کرتی ہیں۔ امریکی سی آئی اے نے محض جاسوسی نہ کی بلکہ اُس جاسوسی پہ ردعمل کرتے ہوئے دنیا کے ممالک کو برباد بھی کر کے رکھ دیا۔یہی کچھ برین کے جاسوسی والے اوزار کرتے ہیں۔وہ جاسوسی بھی کرتے ہیں اوران میں سے بالخصوص ہاتھ، پاؤں اور آنکھ برین کے احکامات پر عملدرآمد کرنے کے ہرکارے بھی ہیں۔اب یہ آلات صرف حکم کا پیغام نہیں لے جاتے بلکہ عملدرآمد کے ذمہ دار بھی یہی ہوتے ہیں۔۔ عملدرآمد کے ہرکارے!۔

اب ذرا غور کریں کہ اگر دماغ ہی موجود نہ ہو یا کام نہ کر رہا ہو تو وہ سارے چھ کے چھ کام نہ ہوسکیں گے جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔اس قدر ضروری کہ یہ نہ ہوں تو انسان حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ دماغ سوچنے کی ایک آٹومیٹک مشین ہے۔بھئی اسے اپنے جسم،اور جسم کے گردوپیش کی دنیا سے الگ کر دو تو یہ ''مبارک ہوٹل'' میں مغز کے نام سے سالن بن جاتا ہے۔مغز تو اپنے کارندوں کے بغیر بے کار ہے۔حواس اُس کے لیے جاسوس بن کر گردوپیش کی اطلاعات اُسے فراہم کرتے ہیں۔میٹریل دنیا کی اطلاعات۔انہی شبیہوں کو پراسیس کر کے مغز نئی نئی شکلیں صورتیں تخلیق کرسکتا ہے۔گوکہ کمپوٹر بھی چیزیں یاد رکھ سکتا ہے ،محدود پیمانے کی چھان بین بھی کرسکتا ہے اور حل بھی۔مگر سوچنا صرف انسان کا وصف ہے ۔مغز ہی کمپیوٹر کی ساری ''صلاحیتوں'' کی تعمیر کرتا ہے۔خواہ یہ جتنی بھی پیچیدہ کیوں نہ ہوں۔ کمپیوٹر،اور دیگر ساری مشینیں انسانی مغز اور دست و بازو کے کام کرنے کی صلاحیتوں کو سہولت فراہم کرنے کے محض اوزار ہیں''۔اور مغز کا کام ہے: سوچنا،فیصلہ کرنا،اور اس پر عمل کروانا۔

سوچنا مغز کا کام،اور مغز کی محنت ہے۔تو یہ بھی طے ہوگیا کہ محنت صرف اور صرف انسان کی خاصیت ہے۔اس لیے کہ اس میں مغز اور شعور شامل ہوتا ہے۔

صرف برین ہی نہیں بلکہ تمام جاندار مَیٹر اپنے ماحول سے مطابقت اختیار کرتا ہے (اس لیے کہ اس کی بقا اسی میں ہے،ورنہ تو وہ مر جائے گا۔جاندار میٹر کی فزیکل اور آرگینگ صفت ہے کام کرتے رہنا۔فطرت کے دیگر اعضا کی طرح مغز (نیوران جس کا یونٹ ہے) بھی ساکت و بیکار نہیں رہ سکتا۔بازو اور ٹانگ کے پٹھوں اور سیلز (Cells) کی طرح مغز اور اُس کے سیلز کی یہ طبعی ضرورت اور مجبوری ہے کہ وہ حرکت کریں،ورزش کریں،صحت مند رہیں،اپنے آپ کو قائم رکھیں اور آگے بڑھیں۔

عام اصطلاح میں تجسس انسانی برین کا بنیادی اور مستقل فناں مناں ہے۔اپنی آرگینگ صفت کے باعث مغز کام کرنے پر مجبور ہے۔یہ جب سرگرم ہوتا ہے تو خوش رہتا ہے اور جب بیکار رہتا ہے تو خفا اور مرجھا جاتا ہے،غیر مطمئن رہتا ہے(1)۔

3۔ بیرونی دنیا

ہم نے شعور کے لیے ضروری آرگنز یا اعضا کے نام تو لیے مگر ہمیں تیسری چیز ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے۔ یعنی یہ کہ ناک میں خوشبو کہاں سے آتی ہے، آنکھ کے دیکھنے کی بات تو ہم کر چکے مگر اِن نظاروں کا منبع کیا ہے، کانوں میں آنے والی آوازوں کا سرچشمہ کیا ہے۔ ٹچ اور ٹمپریچر کے سورس بھی تو باہر ہیں۔

یہ تیسری اور مساوی طور پر اہم چیز ''بیرونی دنیا'' ہے۔ بیرونی دنیا نہ ہو تو کیا نوزائیدہ، کیا میچور شخص، کچھ بھی جانا نہیں جا سکتا۔ کچھ بھی کیا نہیں جا سکتا۔ انسانی بچہ پرندوں کو اڑتا نہ دیکھتا تو بڑا ہو کر ''رائٹ برادران'' پیدا نہ کرتا۔ لکڑی کے بڑے تختے کے تیرتے رہنے اور لوہے کی معمولی کیل کو ڈوبتے ہوئے نہ دیکھتا تو سمندر کے سینے پہ ہزاروں ٹنوں کے بحری جہاز نہ دوڑا سکتا۔ بہرحال ہماری ساری سوچ، خیال، اور کارنامے ہم سے باہر کی میٹیریل دنیا کے فریم میں ممکن ہیں۔ چنانچہ ''انسان کے علم کا سرچشمہ، اُس کا شعور دراصل اُس کے آس پاس کی دنیا ہے''۔ اور یہی آس پاس کی میٹریل دنیا اُس کے عمل کا میدان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے انقلابی جماعت کسی پہلوان، پنڈت اور فردِ واحد کی خیالی باتوں، اور اُس کی خواہش یا حکم کو اپنے عمل کی بنیاد نہیں بناتی۔ وہ تو سماج کی اصل میٹریل حالت پہ نظر رکھتی ہے۔ سماج کی اپنی میٹریل ضرورتوں کو جانچ کر اُن کے حصول کے لیے کوششیں تیز کرتی ہے۔ اُس سارے کام کے لیے اس کا سماج کی اصل زندگی سے پیوست رہنا ضروری ہوتا ہے۔ ارادہ خواہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو تاریخی قوتوں کو ضرور دیکھنا ہوتا ہے۔

4۔ عمل

جاننے یا علم کے لیے چوتھی چیز موجود نہ ہو تب بھی ہماری جانداری کا استحقاق مجروح رہتا ہے۔ وہ چوتھی چیز ہے: عمل۔ عمل کمال کی چیز ہوتا ہے۔ دیکھیے، انسان کی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اُن کی برآوری کے لیے اس نے محنت کرنی ہوتی ہے، عمل کرنا ہوتا ہے۔ اس محنت یا عمل کو ''پیداواری عمل'' کہتے ہیں۔ اس عمل میں اس کا ڈائریکٹ آمنا سامنا خارجی دنیا سے ہوتا ہے۔ یہاں اب اُس نے نئے نئے تجربات کرنے ہوتے ہیں۔ یہی تجربات بعد میں اس کا علم بن جاتے ہیں۔ اور وہ اگلی بار اسی علم کو بروئے کار لا کر اپنے پیداواری عمل کو تیز اور زیادہ پیداواری بناتا ہے۔ نئی مشینیں بناتا ہے۔ نہریں کھودتا ہے۔ سڑک اور پل بناتا ہے۔

یعنی علم، برین، اُس سے بیرونی دنیا کے وجود، حسیات کی موجودگی، اور بیرونی دنیا پہ انسانی عمل کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے۔ اور انسانی سرگرمی کا مطلب ایک فرد نہیں بلکہ انسانی سماج ہوتا ہے۔

اسی سارے پراسیس میں جہالت سے جاننے کی طرف، وہاں سے زیادہ جاننے کی طرف اور بالآخر مکمل جاننے کی طرف رواں سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی عقل پیدائشی موجود نہیں ہوتی بلکہ ماحول اُس کے ذہن پر تاثرات نقش کرتا ہے۔ پھر مشق اور تجربہ اس کو ترقی دیتے جاتے ہیں۔ انسانی علم قدم بہ قدم نشوونما پاتا جاتا ہے، نچلی سے بلند تر سطح کی طرف، اتھلائی سے گہرائی کی طرف، ایک پہلو سے ہمہ پہلو کی طرف۔ یہی مشاہدہ اور مشق سے حاصل شدہ قابلِ تصدیق حقائق ہی کو علم کا درجہ حاصل ہے۔

علم کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ آپ ایک معمہ حل کریں، ایک سوال کا جواب تلاش کریں تو وہ جواب اپنے اندر سے دو نئے سوالات کھڑے کر دیتا ہے۔ علم نیچر اور میٹر پر پیداواری عمل کے دوران پیدا ہوتا ہے۔ بتدریج بڑھتا ہے۔ ایک وقت تک کی دریافتیں آنے والی نسلوں کے لیے مواد فراہم کرتی ہیں جس کی بنیاد پر اگلی نسل اس کو آگے بڑھاتی ہے۔ یوں علم کبھی مکمل ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ جوں جوں انسان فطرت یا میٹر کی تسخیر کرتا جائے گا علم بڑھتا چلا جائے گا۔

یہ بھی دیکھیے کہ میٹر اور کائنات کے بارے میں جو نتائج جن تجربات سے اخذ کیے جاتے ہیں وہ ہر خاص و عام کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ کوئی بھی شخص، کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی مقام پر انہیں دوہرا سکتا ہے۔ ان سائنسی حقائق والے نتائج سے عمومی قوانین اخذ کیے جاتے ہیں۔

انسان پہلے پہل تو خارجی اشیا کو دیکھتا سونگھتا یا چکھتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے وہ ان اشیا

کو سمجھنے لگتا ہے۔ یہ ادراکی علم جب تک مزید عمل میں نہ جائے، ترقی نہیں کرسکتا۔ چلنے کا عمل آج بھی جانوروں جتنا رہتا اگر انسان پاپوش نہ بناتا، جانوروں کو سواری کے بطور استعمال کرتے کرتے ہائی ویز اور ترقی یافتہ کار موٹر نہ بناتا۔ دوسرے شعبوں میں بھی یہی صورت تھی۔ اس لیے کہ انسان کا سماجی عمل صرف پیداوار کے اندر سرگرمی تک محدود نہیں ہوتا۔ اس سماجی عمل کی کئی شکلیں ہوتی ہیں: کلاس سٹرگل، سیاسی زندگی، سائنسی اور آرٹسٹی شاہ پارے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سماجی وجود کے بطور انسان سماج کی عملی زندگی کے سارے شعبوں میں حصہ لیتا ہے۔ بالخصوص کلاس سٹرگل انسانی علم کی نشوونما پر زبردست اثر ڈالتا ہے ۔

دوسرے لفظوں میں علم عمل کے ساتھ شروع ہوتا ہے ۔ پرسیپشنل علم عمل سے حاصل (acquire) کیا جاتا ہے۔ اور یہ پھر واپس عمل میں چلا جاتا ہے۔ حسیاتی علم پہ عمل ہوا تو علم بنا۔ اس علم کو مزید عمل میں ڈالا تو مزید علم بنا۔ اسی دائرے میں سے تو ہر ہر شعبہ کی سائنس نکلی، ٹکنالوجی نکلی۔ آلات، سادہ سے پیچیدہ آلات، ادنی سے اعلیٰ آلات۔ ایسے لگتا ہے کہ خارجی دنیا، برین، عمل اور آلات، گاڑی کے چار پہیے کی صورت موجود ہیں۔

اِدھر ہی کہیں علم کی پانچویں انگلی بھی سامنے آجاتی ہے: نظریہ۔ نظریہ لگتا ہے علم یا علوم کا نچوڑ بن چکا ہو۔ سچائی کا گہرا انعکاس کنندہ۔

ان سارے کاموں سے اُسے مزید علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ مزید قوانین دریافت کرتا ہے اور خارجی دنیا کو مزید تسخیر کرتا جاتا ہے۔ یہ سارا کام چونکہ مزدور پیشہ لوگ کرتے ہیں اس لیے وہ اپنا نظریہ بناتے ہیں۔ مارکسزم اسی نظریے کا نکھرا ہوا روپ ہے۔

علم (نظریہ) خود انقلاب و تبدیلی نہیں لاتا۔ وہ تو عمل کے گائیڈ اور ساتھی اور معاون کے بطور کام کرتا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ عمل سے نظریہ وجود میں آیا، نظریہ سے عمل نہیں۔ ہاں، اب یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

***

نظریہ عمل کا رہنما بن جاتا ہے۔ یوں نظریہ اور عمل ایک طرح کی وحدت بناتے ہیں، ایک

دوسرے کا سہارا اور جوڑی بناتے ہیں۔ ایک دوسرے سے مدد لیتے ہوئے ایک دوسرے کو ڈویلپ کرتے جاتے ہیں۔ یہ دونوں متحرک رہتے ہیں۔ ہمہ وقت رواں، ہمہ وقت تازہ، ہمہ وقت جواں، ہمہ وقت مستعد۔ اور ہمہ وقت معروضی۔

سماجی شعور خیالات، نظریات، نقطہ ہائے نظر، سماجی جذبات، عادات اور اطوار کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسانوں کے سماجی وجود کا انعکاس سماجی شعور کرتا ہے۔

طبقاتی سماج میں سماجی شعور ایک طبقاتی کردار کا حامل ہوتا ہے۔ ایک خاص طبقے کے سیاسی، قانونی، اخلاقی، فن کارانہ اور دیگر خیالات ونظریات کا مجموعہ اُس کی آئیڈیالوجی کی تشکیل کرتا ہے۔

ایک ایسا سماج جسے مخاصمانہ طبقاتی تضادات نے چیر پھاڑ کر رکھا ہو، وہاں ایک واحد آئیڈیالوجی ممکن ہی نہیں ہوتی۔ استحصال کرنے والے اور استحصال کے شکار طبقات کی اپنی الگ الگ آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔ کلاس سٹرگل کی ایک شکل کی حیثیت سے گہری نظریاتی جدوجہد ہمیشہ ایک مخاصمانہ طبقاتی سماج کی خصوصیت رہی ہے۔

سماج کی نشوونما میں خیالات کے فعال رول سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نظریہ جب عوام الناس کے دل و دماغ میں گھر کر لیتا ہے۔ تو پھر یہ ایک میٹریل قوت بن جاتا ہے۔ اس قوت کی موجودگی کے بغیر ہر عمل، ہر جدوجہد اور ہر لڑائی اندھیرے میں تیر چلانے جیسی ہے۔

اصل میں معروضی دنیا کے قوانین کو سمجھنا، اور نتیجتاً اس کی تشریح کرنا، سب سے اہم نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کو بدلنے کے لیے ان قوانین کے علم کا سرگرمی سے اطلاق کرنے کے قابل ہونا سب سے اہم ہے۔ تھیوری اہم ہے۔ یعنی انقلابی تھیوری کے بغیر انقلابی تحریک نہیں ہوسکتی۔ مگر تھیوری فقط اور فقط اس لیے اہم ہے کہ یہ عمل کو گائیڈ کرسکتی ہے۔ اگر ہمارے پاس زبردست تھیوری موجود ہے اور ہم اسے بار بار رٹتے بھی ہیں مگر اسے عمل میں نہیں ڈالتے تو یہ ٹکے کی بھی نہیں رہتی۔

علم کا سرگرم کام خود کو محض ادراکی (Perceptual) سے استدلالی (Rational) علم کی طرف سرگرم چھلانگ میں اظہار نہیں کرتا بلکہ اسے استدلالی (Rational) علم سے انقلابی

عمل کی طرف چھلانگ میں اظہار کرنا لازم ہے۔ وہ علم جو دنیا کے قوانین کو گرفت میں لیتا ہے، اسے دنیا کو بدلنے کے عمل کی طرف دوبارہ رجوع کرنا ہوگا، اسے از سرِ نو پیداواری عمل میں استعمال کرنا ہے، انقلابی کلاس سٹرگل، اور سائنسی تجربے کے عمل میں۔ یہ تھیوری کو ٹیسٹ کرنے اور ترقی دینے کا پراسیس ہے۔ مزدور کلاس کی پارٹی اپنے نظریے کی بنیاد سماج کی موجودہ ساخت، سماج کے اندر کارفرما معاشی طاقتوں، سماج کے اندر مختلف طبقوں کی اصل حیثیت اور اِن مختلف طبقوں کے تصورات وغیرہ کے علم پہ رکھتی ہے۔

''سماجی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے جو انقلابی عزم درکار ہوتا ہے اس کی لازمی شرط سماج کے ابھرتے ہوئے عناصر میں انقلابی شعور کی تربیت ہے۔ شعور کی اس تربیت میں برسوں صرف ہوتے ہیں۔ یعنی سماجی انقلاب سے پیشتر فکری انقلاب لانا پڑتا ہے۔

سماج میں جابجا آپ کو یہ کوٹیشن نظر آتا ہے کہ علم بہت ضروری ہے۔ مگر ہم اکثر اوقات علم کے ساتھ عمل کے اہم رشتے کو بھول جاتے ہیں یا اسے ثانوی بناتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایک دانشور نے ''علم'' کے باب کو علم کے بجائے ''عمل'' کے عنوان سے لکھا تھا۔

اگر آپ کوئی چیز ڈائریکٹ جاننا چاہتے ہیں، تو آپ کو شخصی حقیقت کو تبدیل کرنے کے لیے عملی طور پر سٹرگل میں حصہ لینا ہوگا۔ علم کا یہی راستہ ہے جس پہ ہر شخص نے سفر کرنا ہے۔ کسی چیز کو جاننے کے لیے بالعموم اور اسے تبدیل کرنے کے لیے بالخصوص، اس چیز یا مظہر کے اندر کودنا پڑتا ہے۔ حصہ لینا پڑتا ہے۔ اگر آپ نے انقلاب کی تھیوری اور طریقے جاننے ہیں تو آپ کو انقلاب میں حصہ لینا ہوگا۔ سارا جینوئن علم ڈائریکٹ تجربہ سے شروع ہوتا ہے۔

مگر ایک شخص ہر چیز کا ڈائریکٹ تجربہ نہیں کرسکتا۔ دراصل ہمارے علم کا بہت بڑا حصہ مثلاً دور دراز کے خطوں اور ماضی کے زمانوں کا علم ہمیں انڈائریکٹ تجربے سے ملتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کے لیے تو یہ علم ڈائریکٹ تجربے سے آیا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے پاس جو علم ہوتا ہے وہ دو طریقوں یعنی ڈائریکٹ اور انڈائریکٹ تجربوں سے آتا ہے۔ جو علم میرے لیے ڈائریکٹ تجربے سے آیا وہ ہوسکتا ہے کہ دوسروں کے لیے اِن ڈائریکٹ تجربات سے آیا ہو۔ یعنی کسی

بھی طرح علم کو ڈائریکٹ تجربے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے تو ''عالمِ کل'' مضحکہ خیز شخص ہوتا ہے۔

''تھیوری اگر انقلابی عمل کے ساتھ کنکٹڈ نہ ہو تو یہ بے مقصد ہوجاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ عمل کا راستہ اگر انقلابی تھیوری سے روشن نہ ہو تو یہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔

اسی لیے ''ہمہ دان'' اور ''اتھارٹی'' جیسے الفاظ غلط الفاظ ہیں۔ ویسے بھی علم اتنا سچا، اتنا سائنسی ہوتا ہے کہ دیانت اور انکساری اس کی ضرورت ہیں۔ چنانچہ دنیا کا سب سے مضحکہ خیز شخص وہ ہے جو ''عالمِ کُل'' ہے، یا جو ''دنیا کا نمبر ون اتھارٹی ہے''۔

عمل کے دوران اَن دیکھی صورتحال نظر آتی ہیں۔ اس لیے آئیڈیاز، تھیوریز، منصوبے یا پروگرام عموماً جزوی طور پر اور کبھی کبھی تو مکمل طور پر تبدیل کیے جاتے ہیں۔ انقلابی وقت میں تو صورتحال تیزی سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اُس وقت اگر انقلابیوں کا علم تبدیل شدہ صورتحال کی مطابقت میں تیزی سے نہیں بدلے گا تو وہ انقلاب کو فتح تک راہنمائی کے قابل نہ ہوں گے۔

ریفرنسز

1۔ اسلم اظہر۔ آرٹ کا جدلیاتی تصور۔ در کتاب ''جدلیات'' ادب و فن اور پائیدار ترقی۔ 2012۔ ایس ڈی پی آئی۔ صفحہ 14

بنیاد اور بالائی ڈھانچہ

Base & Supersturcture

دلچسپ ہے کہ سماج صرف ''انسانی سماج'' کو کہا جاتا ہے۔ کبھی گھوڑوں کا سماج، چیونٹیوں ڈاچیوں کا سماج نہیں سنا۔ نہ ہی کبھی پہاڑوں، ہواؤں، قبروں یا جنوں پریوں کا سماج پڑھنے سننے میں آتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سماج صرف زندہ انسانوں کا ہوتا ہے۔

مگر، ایسا کیوں ہے؟۔کون سے انسانی کمال نے اُسے سماج کا مالک بنایا؟۔

اپنی ''اشیائے ضرورت'' خود پیدا کرنے کی صلاحیت نے انسان کو سماج میں ڈھال دیا۔

صرف ایک ضرورت مشترک طور پر سارے جانداروں میں موجود ہوتی ہے: خوراک ۔یہ گویا انسان میں بھی بنیادی ترین ضرورت ہوتی ہے۔مگر جاندار اپنی خوراک خود پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ نیچر میں موجود جڑی بوٹیوں پھلوں یا ایک دوسرے کے گوشت کو چیر پھاڑ کر کچا کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔انسان اپنی خوراک خود پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

خوراک کے بعد انسان کو موسموں کی شدت سے بچنے کے لیے دو مزید ضرورتوں نے آن گھیرا۔ایک پوشاک اور دوسرا سر چھپانے کو جگہ۔پوشاک کی ضرورت جانوروں کو نہ تھی۔اس لیے کہ اُن کو سائبیریا، زیارت اور ہربوئی، جیسے سرد علاقوں میں لمبے لمبے بالوں کی سہولت موجود تھی جبکہ سبی اور جیکب آباد جیسے گرم موسموں میں اس کی کھال پہ برائے نام بال ہوتے ہیں۔انسان کے جسم پہ بال لمبے چھوٹے کرنے کی سہولت نہ تھی۔اس سردی سے بچنے کے لیے اُسے بڑے بڑے بالوں والے جانوروں کی کھال پہننی پڑی اور پھر آہستہ آہستہ اسے ترقی دیتے ہوئے پورا لباس تیار کرنا پڑا۔

تیسری ضرورت بھی موسموں کی شدت نے پیدا کی: رہائش کی۔

یوں یہ تین بنیادی ضرورتیں ہیں انسان کی۔مگر ضرورتوں کی یہ تینوں اشیا کی لسٹ مبہم ہے۔اس لیے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضروریات بڑھاتا رہا ہے۔اکیسویں صدی کی ضرورت یعنی موبائل فون ایک صدی پہلے تک ایک تصور بھی نہ تھا۔مگر آج اس نے بنیادی ضرورت کی صورت اختیار کر لی۔ٹرانسپورٹ، کرنسی، صحت، تعلیم وغیرہ وغیرہ۔مطلب یہ کہ خوراک، لباس اور مکان تو آج بھی بنیادی ضرورتیں ہیں۔مگر اُن کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سی اشیا بھی اُس کی بنیادی ضرورت بنتی جارہی ہیں۔اپنی قوتِ محنت سے اپنی ضرورتوں کی پیداوار کرنے کی صلاحیت اسے ''سماج'' کہلوانے کے لیے کوالی فائی کرتی ہے۔

پیداواری سرگرمی کے لیے تین چیزیں اہم ہیں: انسان کی قوتِ محنت، آلات (آلاتِ پیداوار) اور ذرائع پیداوار۔اِن تینوں چیزوں کے مجموعے کو ''پیداواری قوتیں'' کہا جاتا ہے۔

جب آپ اشیا پیدا کرتے ہیں تو آپ کو مل جل کر ایسا کرنا ہوتا ہے، ایک دوسرے سے وابستہ ہونا ہوتا ہے۔اور جس دن انسان سماجی پیداوار کرنے کے عمل میں ایک دوسرے سے بندھ گیا اسی دن سماج کی ابتدا ہوئی تھی۔یہ جو بندھن ہے، پیداواری عمل کے دوران، اس بندھن کو پیداواری رشتے کہا جاتا ہے۔پیداواری قوتیں اور پیداواری رشتوں میں اتحاد کو سماج کا معاشی نظام کہتے ہیں۔ انہی پیداواری رشتوں کے اندر پیداواری قوتیں ترقی کرتی جاتی ہیں۔

پیداواری رشتوں کو دیکھنے کا ایک دوسرا طریقہ بھی ہے۔پیداواری رشتے ذرائع پیداوار اور آلاتِ پیداوار کی نجی ملکیت کا نام ہے۔نجی ملکیت وہ شیطانی جڑ ہے جو کہ سماج کے اندر تادمِ مرگ باہم لڑنے والے دشمن طبقات پیدا کرتی ہے۔۔۔میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ آرٹسٹوں کو ''پنڈورا باکس'' کا قصہ بنانے کی کیوں ضرورت پڑی جبکہ اُن کے پاس ''نجی ملکیت'' کا لفظ موجود تھا۔

اب ہم اس بات تک پہنچ چکے ہیں کہ سماج کی ''بنیاد'' معاشی نظام ہے۔یہ درست ہے کہ معاشی سرگرمی کے لیے کچھ اور چیزیں بھی ممد و معاون ہوتی ہیں اُن میں سے ایک جغرافیہ اور اس کا ماحول ہے۔زراعت میں تو انسانی محنت کے علاوہ زرخیز زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔اِن کی موجودگی میں سماج خوب ترقی کرتا ہے اور ان کی غیر موجودگی سماجی ترقی کی رفتار کو کم کرتی ہے۔

سماج کی ''بنیاد'' یعنی base (یعنی معاشی نظام کو چلانے اور برقرار رکھنے کے لیے base) پر قابض طبقہ نے سیاسی نظام بنایا، نظریاتی نظام بنایا، اخلاقی نظام بنایا۔مطلب یہ کہ یہ تینوں یعنی سیاسی نظام، نظریاتی نظام اور اخلاقی نظام سماج کا base نہیں ہیں بلکہ یہ اس کا بالائی ڈھانچہ (سُپر سٹرکچر) ہیں۔یہ سب کے سب اُس سماج کے معاشی نظام پہ، اور اُس کی مطابقت میں استوار ہوتے ہیں۔یعنی معاشی نظام base (بنیاد) ہے اور باقی سارا کچھ جی ہاں، سارا کچھ اُس بیس کا بالائی ڈھانچہ ہوتا ہے۔سماج کا بالائی ڈھانچہ سماج کے قانونی، سیاسی، ثقافتی، معاشی، سائنسی، فلاسوفیکل، اخلاقی، جمالیاتی اور عقیدتی نظریات پر، اور اُن تمام سے مطابقت رکھنے والے اداروں، تنظیموں، سیاسی پارٹیوں، اور ریاست وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

سماج کی بنیاد یعنی معیشت تو پیداواری رشتوں پہ انحصار کرتی ہے۔یہی پیداواری رشتے

سماج کے سارے ڈھانچے کی بنیاد بناتے ہیں۔سماجی زندگی میں یہ بنیاد زبردست کردار ادا کرتی ہے۔ یہی بنیاد سماج کے بالائی ڈھانچے کو سہارا دیتی ہے اور مستحکم کرتی ہے۔یعنی بالائی ڈھانچہ بنیاد کے بغیر نہ تعمیر ہوسکتا ہے اور نہ ٹھہر سکتا ہے۔بنیاد موجود تو اوپر کا ڈھانچہ بن ہی جاتا ہے۔سر سلامت تو ٹوپیاں بہت۔

یوں، یہ دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔ ہر بالائی ڈھانچے کی ایک بنیاد ہوتی ہے۔اور ہر عمارت یعنی سپر سٹرکچر کی ایک بنیاد ہوتی ہے۔لازم وملزوم۔ایک نہیں تو دوسرا بھی نہیں۔یہ رندو لاشار باہم بھائی بھی ہیں مگر ایک دوسرے کی جڑیں اکھاڑنے کے درپے بھی (بلوچی فوک شعر)۔

قدیم کمیونزم سے قبل چونکہ کوئی نظام موجود نہ تھا اس لیے اُس کی معاشی بنیاد اُس کے قیام کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ بقیہ جو تین نظام ہیں یعنی غلام داری سماج، فیوڈلزم، اور کپٹلزم، وہ تینوں مخاصمانہ نظام ہیں۔اور اُن کی معاشی بنیاد اپنے سے قبل والے معاشی نظاموں کے اندر بننے لگی تھی ۔یعنی غلام دارانہ سماج کی بنیاد کی ابتدا قدیم کمیونزم میں پڑی، فیوڈلزم کی غلام داری نظام میں اور کپٹلزم کی بنیاد فیوڈلزم میں پڑی۔

کمال یہ ہے کہ اِن سارے نظاموں کی بنیاد کسی شعوری جدوجہد کے بغیر ہوئی تھی اور اُن کے صرف آخری مراحل میں کہیں کہیں شعوری جدوجہد کی ضرورت پڑی۔مگر سوشلزم کی بنیاد ایسی ہے جو شعوری جدوجہد کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی ۔ بلکہ یہ اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب مزدوروں کی سیاسی پارٹی، سوشلسٹ انقلاب برپا کردے گی۔

جیسے کہ ذکر ہوا، کہ جیسی بیس ہوگی سُپر سٹرکچر اسی طرح کا ہوگا۔قدیم کمیونزم میں طبقاتی نظام والی base نہ تھی اسی لیے وہاں بالائی ڈھانچہ کے بطور نہ تو کلاسز تھے، نہ کلاس تضادات تھے، نہ سیاست تھی، نہ خیالات ونظریات تھے۔اور نہ سٹیٹ تھی۔

اگلا سماجی مرحلہ غلام داری کا تھا۔چونکہ یہاں سماج یعنی بیس بنیادی نجی ملکیت تھی اس لیے طبقات اور طبقاتی تضادات وجود میں آگئے ۔اس بنیاد کی مطابقت میں بالائی ڈھانچہ ایسے خیالات والا بنا جس میں غلام داری کو جائز اور اچھا قرار دیا جاتا۔ادارے ایسے وجود میں آگئے جو غلاموں کے

خلاف آقاؤں کی بالادستی اور ان کے طبقاتی مفادات کا تحفظ کرتے تھے۔اور سب سے منظّم ومتنوع ادارہ تو ریاست یعنی سٹیٹ کے نام سے وجود میں آیا۔جو آقا اور غلام کے طبقاتی تضادات کو دبانے کے لیے اور آقاؤں کے طبقاتی مفادات کے تحفظ کے لیے تھا۔یہی کچھ فیوڈلزم میں تھا اور ایسا ہی کپٹلزم میں ہے۔

طبقاتی معاشرے کی بنیاد یعنی base کے اندر ہی لڑائی ہورہی ہوتی ہے۔وہاں حاکم اور محکوم دونوں موجود ہوتے ہیں اور یہ دونوں باہم متضاد ہوتے ہیں۔غلام داری میں غلام اور آقا، فیوڈلزم میں فیوڈل اور کسان، کپٹلزم میں کپٹلسٹ اور مزدور۔مطلب یہ کہ ان تینوں سماجوں کی بنیاد (base) متضاد مفادر کھنے والے طبقات کے تعلقات پہ استوار ہے۔اندازہ کیجیے کہ ایسی بیس جس کے اپنے اندر کشت وخون والا تصادم چل رہا ہوتا ہے، تو اُس کا پھر بالائی ڈھانچہ کیسا ہوگا۔ظاہر ہے کہ وہ بھی مخاصمانہ تضادات والا ہوگا۔مطلب یہ کہ کپٹلزم کا بالائی ڈھانچہ یعنی اس کے خیالات و نظریات بھی باہم متصادم ہوں گے ۔ وہاں کپٹلسٹ کے اپنے خیالات اور ادارے ہوں گے اور مزدوروں کے اپنے۔اور اِن دونوں کے خیالات واداروں پر مشتمل بالائی ڈھانچہ ہوگا۔

ایک بات واضح ہونی چاہیے۔وہ یہ کہ ہر طبقاتی سماج میں معاشی بالادستی صرف ایک طبقے کی ہوتی ہے۔اس لیے خیالات، نظریات، سیاست، سیاسی پارٹی پہ مشتمل اداروں والا بالائی ڈھانچہ بھی اسی طبقے کی بالادستی والا ہوگا۔کپٹلزم میں سائنس، علم، ادب، آرٹ سب کپٹلزم کی خدمت کرتے ہیں۔یہ بالائی ڈھانچہ مزدور طبقے کو کپٹلزم کے ازلی ابدی ہونے کا باور کراتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ بیس ساری چیزوں کا تعین کرتی ہے۔مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ سُپر سٹرکچر، بیس کا محض ایک ٹٹو ہے۔بالائی ڈھانچہ، بیس کا محتاجِ محض اور غیر مفعول شوپیس بالکل نہیں ہوتا ۔بالائی ڈھانچہ بیس کو بہت مستحکم بھی کرسکتا ہے، مگر اگر اس کے دماغ پہ شیطان سوار ہوجائے تو یہ وقتی طور پر بیس کی بیخ اکھاڑنے کا سامان بھی کرجاتا ہے۔یعنی نظریات، سیاست اور خیالات بیس کے استحکام اور تعمیر کا کام بھی کرتے ہیں، اور تباہی کا کام بھی۔سپر سٹرکچر بیس کے استحکام، تعمیر یا پھر تباہی کے سلسلے میں انسانوں کو اپنے خیالات کو بروئے کار لانے میں مدد دیتے ہیں۔ نیز اگر یہ بالائی

ڈھانچہ بیس سے ہم آہنگ ہو تو پیداواری قوتوں کی ترقی میں مدد دیتا ہے۔

بالائی ڈھانچہ اگر شرافت دکھائے تو وہ ایک اور زبردست کام یہ کرتا ہے کہ اپنی اب سے پہلے والی بیس کو ختم کر کے نئی بیس کے قیام واستحکام میں مدد دیتا ہے۔

مطلب یہ کہ بالائی ڈھانچہ ''بیس'' کے ساتھ پابہ گل بھی ہے، اور تھوڑا تھوڑا آزاد بھی۔ شروع میں تو بالائی ڈھانچہ اپنی بیس کے ایجنٹ کا رول ادا کرتا ہے۔ یہ اپنے جنم دینے والی بیس کو جائز ثابت کرنے کے لیے دلائل گھڑتا جاتا ہے، اس کا فکری اور طبعی طور پر دفاع کرتا رہتا ہے۔ بالائی ڈھانچہ مخاصم طبقات میں سے غیر حاوی طبقہ کو مارتا پیٹتا ہے، اسے نقصان پہنچاتا ہے۔

بالائی ڈھانچہ ایک اور کام بھی کرتا ہے۔ نئے سماج کا بالائی ڈھانچہ اپنے سے پہلے والے سماج کی بنیاد کو تار پیڈو کرنے کے لیے اُس کے بالائی ڈھانچے میں شامل ہو جاتا ہے اور اُس بنیاد کو اور اُس کے بالائی ڈھانچے کو دیمک لگاتا جاتا ہے۔ کیپٹلزم کا بالائی ڈھانچہ تو سابقہ فیوڈلزم میں ہی پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ محسوس اور غیر محسوس طور پر خود کا Assert کرتا جاتا ہے۔ مقابل آنے والے کی چونڈیاں کاٹتا جاتا ہے۔ اُس کا خون چوس چوس کر فروغ پاتا جاتا ہے۔

مگر کبھی کبھی اُس کا الٹ بھی ہوتا ہے۔ نئے کیپٹلزم میں پرانے فیوڈلزم کے بالائی ڈھانچہ کے جو اجزا زندہ رہ جاتے ہیں۔ اگر اُن سے خبردار رہتے ہوئے، تنقیدی فضا بنا کر انہیں جذب نہ کیا جائے تو وہ بہت نقصان دِہ ثابت ہوتے ہیں۔

اِدھر موجود ایک اور چھوٹی سی ٹیڑھ کا سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ یہ درست ہے کہ سماج تو ایک جاری وساری مظہر ہوتا ہے۔ یہ بنتا بدلتا ہے۔ بنیاد ہی بالائی ڈھانچہ کو جنم دیتی ہے اور بنیاد کی موت کے ساتھ بالائی ڈھانچہ بھی فوت ہو جاتا ہے۔ مگر ایسا، میکانکی انداز میں نہیں ہوتا۔ چونکہ سماج کی بنیاد اور بالائی ڈھانچہ دونوں زندہ اور متحرک مظاہر ہوتے ہیں، اس لیے بنیاد کی موت کی حتمی سیٹی بجنے سے بہت پہلے بالائی ڈھانچہ نئے سماج کی طرف ''بہت'' آہستگی سے بدلنے لگتا ہے۔ مثلاً کیپٹلزم میں جاتے ہوئے فیوڈلزم کی بنیاد گرنے سے قبل اُس کا بالائی ڈھانچہ کیپٹلزم کی جانب سرکنا شروع کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں فیوڈلزم کی بنیاد کیپٹلزم میں بدلنے سے پہلے، فیوڈلزم کے بالائی ڈھانچے

میں کیپٹلزم کے جراثیم سرایت کرنے لگتے ہیں۔ مگر فیصلہ کن بات بنیاد اور بیس ہی کی ہے۔

غلام داری، فیوڈلزم اور کیپٹلزم تینوں میں چونکہ پیداواری رشتے ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کے ہوتے ہیں۔ اس لیے تینوں سماجوں میں جبر، استحصال، افراتفری، نفسانفسی اور خودغرضی بھری ہوتی ہے۔

انسان سماج میں موجود پیداواری رشتوں کے اندر رہنے پہ مجبور ہوتا ہے۔ وہ اپنی ضروریات کے لیے انہی رشتوں کے اندر پیداوار کرتا رہتا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی پیداوار بھی بڑھتی رہے، اور مشقت بھی کم سے کم ہو۔ اس لیے وہ ہمہ وقت آلات پیداوار میں ترقیاں کرتا جاتا ہے۔ اور اُس کی یہی خاصیت دراصل پیداواری رشتوں کا بھٹہ بٹھا دیتی ہے۔ آلات کے ترقی کرتے رہنے سے بالآخر طریقِ پیداوار بدل جاتا ہے۔ اس حد تک کہ موجود پیداواری رشتوں میں ترقی کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب پیداواری رشتوں اور پیداواری قوتوں میں شدید تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن میں زبردست تصادم ہونے لگتے ہیں اور بالآخر پیداواری رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان کی تخلیقی محنت آزاد ہو جاتی ہے۔

آج دنیا کیپٹلزم میں ہے جو آخری طبقاتی سماج ہے۔ اس کے ٹوٹنے سے طبقاتی سماج کی ساری زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور انسان ایک غیر طبقاتی سماج میں خوب آزاد اور بااختیار ہو جاتا ہے

۔

کیپٹلزم کی معاشی بنیاد بورژوازی اور پرولتاریہ کے درمیان مخاصمت کی عکاسی کرتی ہے۔ کیپٹلسٹ سماج کے بیس کا یہی اثر اِس نظام کے بالائی ڈھانچے پر بھی رہتا ہے۔ یوں کیپٹلزم کا بالائی ڈھانچہ یعنی خیالات اور ادارے بھی بورژوا بالادستی والے ہوتے ہیں، اور یہ خیالات وادارے بیس میں موجود نمایاں فریق (یعنی کیپٹلسٹ) کی مدد اور حمایت کرتے رہتے ہیں۔ مگر اسی سماج میں پرولتاریہ بھی اپنی نجات کے خیالات رکھتا ہے، اپنی تنظیمیں (ٹریڈ یونین، سیاسی پارٹی) رکھتا ہے اور خود اپنے خیالات پیش کرتا ہے۔ پرولتاریہ اس سیاسی پارٹی کے توسط سے کیپٹلسٹوں کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔ وہ اپنے نظریے یعنی مارکسزم سے لیس ہوتا جاتا ہے۔ اس کا مقصد کیپٹلسٹ

پیداواری رشتوں کو توڑنا ہوتا ہے۔یعنی بورژوا سماج کی معاشی بنیاد کو تبدیل کرنا۔

نظریات تو عمل ہی میں درست یا غلط ثابت ہوتے ہیں۔آزمائش اور اسکا نتیجہ، نتیجے کی کمی اور کوتاہیوں کو نئی حکمت عملی سے پھر عمل میں ڈالنا یہاں تک کہ مطلوبہ نتیجہ برآمد ہو۔یہ پروسیس ہے کسی نظریے کی سچائی ثابت کرنے کا۔۔نئی حکمت عملی بنا کر عمل میں ڈالنا حکمت عملی کا ارتقا ہے۔نہ کبھی نظریہ جامد ہوتا ہے نہ حکمت عملی جامد ہوتی ہے۔اگر حکمت عملی کو جامد سمجھ لیا جائے تو نظریہ بھی جامد رہتا ہے۔یہاں تک کہ عقیدہ بن جاتا ہے۔

البتہ، یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ صرف میٹریل خیالات ہی زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جن خیالات کا میٹریل دنیا سے تعلق نہیں ہوتا وہ آپ کو پیداواری عمل میں نہیں ڈال سکتے۔ایسے ماورائی خیالات آپ عمل میں نہیں ڈال سکتے اس لیے کہ ہمادی دنیا سے ماورا کچھ بھی ہماری پہنچ میں نہیں ہوتا۔۔سماج اس لیے جاری ساری ہے کہ یہ ایک میٹریل وجود رکھتا ہے اور اس لیے ارتقا پذیر بھی رہتا ہے۔

اخلاقیات

اخلاقیات بالائی ڈھانچے کا ایک اہم رکن ہوتی ہے۔یہ سماج کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہے۔پرولتاری بین الاقوامیت پسندی، سوشلسٹ حب الوطنی ،اور انسان دوستی کا فروغ کمیونسٹ اخلاقیات کے اصول ہیں۔

سائنس

سائنس سماجی شعور کا ایک فارم ہوتی ہے جو علم کے تاریخی طور پر ترقی یافتہ نظام کی نمائندگی کرتی ہے۔ سائنسی علم کی طاقت اُس کے عمومی کردار، عمومیت، لزومیت اور معروضی سچ میں ہے۔سائنس کی سچائی کی تصدیق سماج کے عملی تجربے کے دوران ہوتی جاتی ہے اور یوں یہ مسلسل ایکوریٹ ہوتی رہتی ہے۔

آرٹ کے برعکس جو کہ دنیا کو آرٹسٹک عکسوں میں منعکس کرتا ہے، سائنس دنیا کو منطقی غور وفکر کے ذریعے concepts میں پہچانتی ہے۔

سائنس کی طاقت اس کی جنرلائزیشن میں ہے۔سائنس فلسفیانہ عالمی نکتہِ نظر سے قریبی طور پر جڑی ہوئی ہوتی ہے، جو اُسے معروضی دنیا کی نشو ونما کو کنٹرول کرنے والے عمومی قوانین سے، اور علم کی تھیوری اور تفتیش کے ایک طریقے کے علم سے مسلح کرتا ہے۔صرف جدلیاتی مادیت کا فلسفہ حقیقت کے درست اپروچ کو یقنی بنانے اور وسیع اور باثمر جنرلائزیشن کی راہ کھولنے کو یقینی بنانے کا اہل ہے۔

حادثوں اور بدنظمی کے پیچھے یہ معروضی قوانین کو تلاش کرتی ہے اور اُن کا مطالعہ کرتی ہے۔ معروضی قوانین کے علم کے بغیر شعوری اور مقصدی عملی سرگرمی ناممکن ہے۔

مادی پیداوار، اور سماج کی ترقی کی ضروریات سائنس کا قوتِ محرکہ ہیں۔

سائنسی آگاہی کی جدلیات، نئی دریافتیں اور تھیوریاں سابقہ نتائج کو کینسل نہیں کرتیں؛ وہ محض اپنے اطلاق کے حدود کو مخصوص کرتی ہیں اور اور اُن کی معروضی سچ کی نفی نہیں کرتیں، سائنٹفک علم کے عمومی نظام میں اپنی جگہ کا تعین کرتی ہیں۔

سائنس سماج کی پیداواری سرگرمی کی ضروریات سے ابھرتی ہے۔یہ پھر، سماج کی ترقی کے راستے کو بڑے پیمانے پر متاثر کرتی ہے۔سائنس کے بغیر آج کی پیداوار کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا، جس کا رول مسلسل بڑھتا چلا جارہا ہے۔

سائنس بہت بڑی نعمت ہے۔انسان کے ہاتھ ایک ایسا وسیلہ جو اُس کی زندگی کو باسہولت بناتی ہے۔

مگر کیپٹلزم کے اندر سائنس کیپٹلسٹ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔اس لیے وہ اسے اپنے حریف یعنی محنت کرنے والے عوام کے خلاف لڑائی میں ایک ہتھیار کے بطور استعمال کرتا ہے۔ایک وسیلہ بناتا ہے۔کیپٹلسٹ کے ہاتھ میں سائنس زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔

فلسفہ، مذہب اور اخلاقیات کے ذریعے مختلف طبقات اور پارٹیوں کا نظریہ سائنس میں داخل ہوتا ہے۔جو نظریہ کسی سماج پہ بالادستی پاتا ہے وہی مختلف طریقوں سے سائنس دانوں پہ بھی

مسلط ہوجاتا ہے: روایات کے ذریعے سے، نظام تعلیم کے ذریعے سے اور براہِ راست نظریاتی اور سیاسی اثر سے۔ سائنس دانوں کی سوچ کا عمومی ٹرینڈ بورژوا سماج کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ سائنس دان جدید کیپٹلسٹ سماج میں آئیڈیلزم اور میٹافزکس کی بالادستی سے متاثر ہوتا ہے۔

بورژوا سماجی سائنس براہِ راست کیپٹلزم کے دفاع، کیپٹلزم کے دم توڑتے ہوئے نظام کی لیپاپوتی اور کمیونزم اور ترقی کے خلاف شدید حملوں کے لیے وقف ہوتی ہے۔

مگر جب سماج کی نجی ملکیت والی معاشی بنیاد ڈھے جاتی ہے تو یہی سائنس عوام الناس کی بن جاتی ہے۔ جہاں یہ بغیر رکاوٹ ترقی کرتی جائے گی، نکھرتی جائے گی۔ نجی ملکیت کی خدمت کرنے کی شرط جو ہٹ گئی۔ تب یہ سماج کی ایک ڈائریکٹ پیداواری قوت بنتی جائے گی۔

آرٹ

آرٹ سماجی شعور اور انسانی سرگرمی کا ایک خصوصی فارم ہوتا ہے جو آرٹسٹک امیجز میں حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ آرٹ دنیا کی جمالیاتی تفہیم اور صورت گری کا اہم ترین ذریعہ ہے۔

سائنس کے برخلاف، ادب و آرٹ صداقت کا انعکاس تصورات میں نہیں کرتا، بلکہ ایسی ٹھوس شکل میں کرتا ہے جس کا حواس کے ذریعے ادراک کیا جاسکتا ہے۔

آرٹسٹ جن مقاصد اور آئیڈیلز کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ سماج اور عہد ہی سے آتے ہیں۔ آرٹسٹ تو خود ہی مخصوص سماجی رشتوں کی پیداوار ہوتا ہے۔ اُس کے جمالیاتی خیالات سماجی حالات کا عکس ہوتے ہیں۔

آرٹ سماج کے بالائی ڈھانچے کا ایک حصہ ہوتا ہے اور اس طرح یہ اس بنیاد (base) کو تقویت پہنچاتا ہے جس نے اسے وجود بخشا اور جس پر یہ فروغ پا رہا ہے۔

ایک طبقاتی سماج میں آرٹ پیداوار کی سطح کی ڈائریکٹ عکاسی نہیں کرتا بلکہ سماجی حالات، کلاس سٹرگل کے راستے اور دورانیے کا مجموعہ پیش کرتا ہے۔ تسلسل آرٹ کی ترقی میں بڑا رول پلے کرتا ہے۔ عالمی آرٹ کی عظیم کلاسیکل تخلیقات جن سماجی حالات میں وہ تخلیق کی گئی تھیں، اُن حالات کے غائب ہوجانے سے مرنہیں جاتیں، بلکہ سماجی انسانی جذبات اور مُوڈز کا اظہار کرتی ہوئی ایک نئی

زندگی جینا جاری رکھتی ہیں۔

محنت آرٹسٹک تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ یہی محنت ابتدائی انسان کے جمالیاتی جذبات اور ضروریات کو شکل دینے کے پراسیس کا سرچشمہ تھی۔ قدیم انسانوں میں آرٹ کا محنت کے ساتھ ایک فوری، براہِ راست اور سادہ تعلق رہا۔ بعد میں یہ تعلق پیچیدہ بنتا گیا۔

سماجی وجود کے عکس کا ایک فارم ہوتے ہوئے آرٹ سماج کی روحانی زندگی کے دوسرے شعبوں (سائنس، ٹکنالوجی اور سیاسی نظریہ) سے بہت سی باتوں کا اشتراک رکھتا ہے۔ لیکن بہ یک وقت آرٹ کے ایسے خصوصی فیچر بھی ہوتے ہیں جو اُسے سماجی شعور کے دوسرے تمام فارموں سے ممتاز بناتے ہیں۔ حقیقت کے ساتھ انسان کا جمالیاتی تعلق آرٹ کا مخصوص موضوع ہے۔ دنیا کی آرٹسٹک صورت گری آرٹ کا معینہ کام ہے۔ یہی سبب ہے کہ جمالیاتی تعلقات کی گاڑی ہونے کے ناطے انسان ہمیشہ آرٹ کے کسی کام کے مرکز میں ہوتا ہے۔

آرٹسٹک امیجز آرٹسٹ کی طرف سے زندگی کے بارے میں اُس کے علم اور مہارت کی بنیاد پر تخلیق کیے جاتے ہیں۔ آرٹ کی تاریخ، حقیقت، جمالیاتی آگاہی کی توسیع، اور اسے امیر بنانے، اور انسان کی طرف سے دنیا کی تبدیلی کی گہری آرٹسٹک عکاسی، کی تاریخ ہے۔ آرٹ کی ترقی سماج کی ترقی، اور اس کے طبقاتی ڈھانچے میں تبدیلیوں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔

کیپٹلسٹ طرزِ پیداوار آرٹ کا مخالف ہے اس لیے کہ یہ اعلیٰ سماجی اور روحانی آئیڈیلز سے نفرت کرتا ہے۔

کیپٹلسٹ سماج میں پروگریسو آرٹ یا تو کیپٹلزم کے ظہور کے دور میں موجود تھا، جب بورژوازی ابھی تک ایک پروگریسو طبقہ ہوا کرتی تھی، یا، آرٹسٹوں کی سرگرمی سے جو کہ اس نظام کے ناقد ہیں۔

آرٹ کا تعلق عوام سے ہے۔ اس کی جڑوں کو محنت کش عوام کے درمیان گہرائی کے ساتھ پیوست ہونا چاہیے۔ یہ آرٹ ایسا ہونا چاہیے کہ عوام اُسے سمجھیں اور اُس سے محبت کریں۔ ضروری ہے کہ یہ اُن کے احساسات، خیالات اور عزائم کو متحد کرے اور انہیں بلندی عطا کرے۔

سوشلسٹ انقلاب معاشی اور روحانی غلامی کی زنجیریں توڑ کر کلچر پہ استحصالی طبقے کی اجارہ داری ختم کر دیتا ہے اور ساری کلچرل امارت اور علم کو عوام کی ملکیت بنا دیتا ہے۔

بلاشبہ آرٹ عوام کی ملکیت ہوتا ہے، عوام کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اُسے اس کی ضرورت ہے۔ عظیم موسیقی، نفیس رقص، فائن پینٹنگ، اور عظیم ڈرامہ کو محض چند ''مہذب'' لوگوں کی مسرت کے لیے نہیں رکھنا چاہیے، اسے عوام الناس کو بلا قیمت دینا چاہیے۔ یہ اُن کے لیے اتنا ضروری ہے جتنی کہ ہوا اور روٹی ضروری ہے(1)۔

آرٹ کو صندوق میں بند کر کے محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔ اسے تو عوامی سرگرمی کے چوک پہ رکھا جائے تا کہ وہ لین بھی کر سکے اور دَین بھی۔ تبھی آرٹ اور کلچر محفوظ رہ سکتے ہیں۔

اس کا ایک اور مطلب یہ بھی ہے کہ آرٹ کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

نظریہ

مارکسزم، مخالف نظریات کے بیچ کسی کمپرومائز کو تسلیم نہیں کرتا۔ ایک ہی چوائس ہوتی ہے ۔۔۔ بورژوا یا سوشلسٹ نظریہ۔ درمیانی راستہ نہیں ہے۔ ایک طبقاتی سوسائٹی میں ایک غیر طبقاتی یا طبقاتی نظریہ سے بالاتر کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ اس لیے سوشلسٹ نظریہ کو کسی بھی طرح کمتر بنانا، یا اس سے ذرا سا بھی دور ہٹنا بورژوا نظریہ کو تقویت دینا ہے۔

ریفرنسز

1۔ ایساڈورا ڈنکن۔ مائی لائف۔ وکٹر گولانز۔ 1968۔ لندن۔ صفحہ 158

تاریخ میں فرد کا رول

خود تاریخ کچھ نہیں کرتی۔ کوئی بڑی دولت اُس کے قبضے میں نہیں ہے۔ یہ کوئی جنگیں نہیں لڑتی۔ تاریخ کچھ نہیں، یہ آدمی ہے جس سے تاریخ بنتی چلتی ہے، اصلی زندہ آدمی یہ سب کچھ کرتا ہے۔ آدمی کے پاس دولت ہوتی ہے، آدمی جنگیں لڑتا ہے۔

تاریخ کچھ نہیں ماسوائے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آدمی کی سرگرمی کے۔ مطلب یہ کہ سماجی آدمی سماجی ترقی کا خالق ہے اور اُسے چلانے والا ہے۔

سماج کی تاریخ عوام بناتے ہیں۔

میٹیریل دنیا میں سب کچھ میٹیریل قوانین کے تحت چلتا ہے۔ اور یہ قوانین اٹل ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو کسی جادوگر کے کرتبوں سے تبدیل ہوسکتے ہیں، اور نہ کسی پیر کے دم چُھو سے انہیں بدلا جاسکتا ہے۔ ان میٹیریل قوانین میں کسی میر و معتبر اور خان و سردار کی تدبیر اور بہادری کوئی تبدیلی نہیں لاسکتی۔ کسی زندہ یا مردہ سینٹ یا سادھو کے مہربان یا غضبناک ہونے سے ان قوانین کی رفتار اور راستے میں کوئی تغیر برپا نہیں ہوسکتا۔ یہ میٹیریل قوانین لفنگوں، بدعنوانوں، سمگلروں، راسپوٹینوں اور کسی حاضر، یا ریٹارڈ جنرل کے زور سے بھی تبدیل یا ختم نہیں ہوسکتے۔۔۔۔ سماج اور کائنات سختی سے قوانین کے تابع ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ تاریخ کا عمومی کاز، اس کی اہم سمت ایک فرد پہ انحصار نہیں کرتے خواہ وہ فرد کتنا بھی زبردست ہو۔ نہ ہی سب سے اہم شخصیت ہسٹری کی عمومی سمت کو تبدیل کرسکتی ہے۔

انسان بھی انہی اٹل قوانین کا پابند ہے۔ نہ ایک انچ اِدھر نہ ایک انچ اُدھر۔ بس اُسی چوکھاٹ میں رہتے ہوئے، اور انہی قوانین کو استعمال کرتے ہوئے اپنی اشرف المخلوقاتی مظاہر کو نکھارتے رہنا ہے۔

ہسٹارکل میٹریلزم کا مطلب ہے: ڈائیلیکٹیکل میٹریلزم کے اصولوں کو سماج کی تاریخ کے سمجھنے کا آلہ بنایا جائے۔ یعنی جب ڈائلیکٹکل میٹریلزم کو انسان اور انسانی سماج پر لاگو کیا گیا تو اسے ہسٹارک میٹیریلزم کا نام دیا گیا۔ ڈائلیکٹکل میٹیریلزم اور ہسٹارکل میٹریلزم ایک اٹوٹ مجموعہ ہے۔ بہ یک وقت ایک کی غیر موجودگی اور دوسرے کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہم زندگی گزارنے یعنی پیٹ بھرنے، لباس تیار کرنے اور رہائش کا انتظام کرنے کے لیے اوزار استعمال کرتے ہیں۔ یہ اوزار ایک پتھر بھی ہوسکتا ہے، ایک کلہاڑی بھی، پیچ کس بھی، دیوہیکل مشین بھی اور کمپیوٹر چپ بھی۔ ان اوزاروں کو ''آلاتِ پیداوار'' کہتے ہیں۔

لیکن یہ اوزار از خود پیداوار نہیں کرسکتے۔ انہیں آپ کسی چیز پہ استعمال کر کے ہی اپنی ضروریات حاصل کرسکتے ہیں۔ ہماری ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے کے لیے جس چیز پہ یہ اوزار استعمال ہورہے ہوتے ہیں اُس چیز کو ''ذرائع پیداوار'' کہتے ہیں۔ مثلاً زمین یا فیکٹری۔ انسانی محنت اور آلات باپ ہیں اور زمین یا فیکٹری، ماں ہے۔

اب ''آلاتِ پیداوار اور ذرائع پیداوار'' جمع ہوتے ہیں تو ہم اسے ''مینز آف پروڈکشن

'' کہتے ہیں۔

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ آلاتِ پیداوار خواہ فرسودہ تھے یا ترقی یافتہ، انہیں استعمال کرنے والا تو انسان تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے تجربوں کو بروئے کار لاتا رہا، اور اِن آلاتِ پیداوار کو ترقی دیتا رہا تا کہ مشقت بھی کم ہو اور پیداوار بھی زیادہ ملے۔ اِسے ہنر، یا علم، یا ٹکنالوجی کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ علم کا سرچشمہ آلات پیداوار ہے۔ یہی ہنر، یہی سائنس اور یہی ٹکنالوجی شعور کی بنیاد ہے۔

یہ ترقی یافتہ آلات پیداوار اور اُسے استعمال کرنے والا شعور یافتہ محنت کش آدمی مل کر ''پیداواری قوتیں'' یا ''پراڈکٹو فورسز'' بناتے ہیں۔

ضروریات کو پیدا کرنے کے دوران لوگ آپس میں کسی بندھن میں ہوتے ہیں۔ اس بندھن کو، اِس ریلیشن شپ کو پیداواری رشتے یا ریلیشنز آف پروڈکشن کہتے ہیں۔ یہ دراصل سماج ہی ہوتا ہے جس میں منظّم ہو کر انسان پیداوار کرتا ہے۔

اور اوپر کی ساری چیزوں کو ملا کر اس سارے مجموعے کو ''methods آف پروڈکشن'' (طریق پیداوار) کہتے ہیں۔

پیدواری رشتے اگر پیداواری قوتوں (محنت کش اور آلاتِ محنت) کی مطابقت میں ہوں تو زبردست ترقی ہوتی ہے۔ یہ تعلقات فیوڈل ازم میں مختلف تھے۔ وہاں سے آلاتِ محنت کی ترقی کے ساتھ ساتھ محنت کش بھی ترقی کرتا گیا۔ نتیجہ یہ کہ فیوڈل پیداواری رشتے بالآخر ترقی میں رکاوٹ بن گئے اور لہذا اُن کا ٹوٹنا ضروری ہو گیا تھا۔

ملکیت کی صورت دراصل پیداواری رشتوں کا تعین کرتی ہے۔ اگر ملکیت عوام کی مشترکہ ہے تو پیدواری رشتے استحصال سے آزاد انسانوں کے بیچ تعاون اور باہمی مدد کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اگر ملکیت ذاتی، نجی یا پرائیویٹ ہے تو پیداواری رشتے غالب و مغلوب والے ہو جاتے ہیں۔ غالب، مغلوب کو مغلوب ہی رکھنے کی تدابیر کرتا رہے گا اور مغلوب اپنی مغلوبیت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے غالب کو نیست و نابود کرنے تک کی جدوجہد کرتا رہے گا۔

پیداوار کی ایک خاصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ جامد نہیں رہتی، بلکہ بڑھتی اور بہتر ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے کہ انسان ایسا کرنا چاہتا ہے اور ایسا کرتا ہے۔ انسان اس لیے ایسا کرتا ہے کہ اس کی ضروریات بڑھ رہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ پیداوار کی بڑھوتری اور بہتری ایک معروضی ضرورت ہے، ایک قانون ہے۔

مگر یہاں صورتحال ایک دلچسپ موڑ مڑتی ہے۔ پرانے پیداواری رشتوں اور ترقی یافتہ آلات و انسان کے بیچ ایک تضاد سا پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور بڑھتے بڑھتے یہ پیداواری قوتیں اپنے گرد موجود فرسودہ شدہ پیداواری رشتوں کی پابندیاں، حدود اور چوکھاٹ سے نباہ کرنے سے قاصر ہو جاتی ہیں، اور پھر وہ انہیں توڑ ڈالتی ہیں۔ اور اپنے لیے ایک نیا اور ارتقا یافتہ پیداواری رشتے بناتے ہیں۔

اس سارے ارتقائی سفر میں انسان مختلف مدارج سے گزرا۔ سارا ارتقا آلاتِ پیداوار، انسانی مہارت یافتہ، اور باریکی سے کام کرنے والی انگلیوں بازوؤں اور اِن دونوں سے اخذ کردہ ہنر سے وجود میں آتا رہا۔ یعنی بنیاد مَیٹر ہے، آلات ہیں۔ نہ کہ شعور و عقل و آئیڈیا ہے۔ شعور تو خود مَیٹر کی ایک خصوصیت ہے، اس لیے کہ وہ مَیٹر ہی سے جنم لیتا ہے۔ ہم ایک لفظ ''سماج کا شعور'' استعمال کرتے ہیں یعنی کلچر، فلسفہ، قانون، آرٹ، مذہب، رسوم رواج۔ تو یہ سماج کا شعور بھی سماج کے اندر سے جنم لیتا ہے، سماجی میٹریل حالات سے یعنی موڈ آف پروڈکشن سے۔

اب تک کا انسانی سماج چار موڈز آف پروڈکشن سے گزرا ہے:

1۔ قدیم کمیونزم

جب انسان جانور جیسا تھا اور ترقی یافتہ نہ تھا۔ تب وہ پھل وغیرہ چُن کر گزارہ کرتا تھا۔ اُس دور کو ''چُننے والا'' یا ''گیدرر سماج'' کہتے ہیں۔ ساتھ میں وہ فریب دے کر یا کبھی کبھی پتھر ڈنڈا استعمال کر کے جانوروں کا شکار کرتا تھا: ''ہنٹرز سماج''۔ بعد میں وہ شکار میں تیر کمان ،اور نیزہ بھی استعمال کرنے لگا۔ اُس دور میں جنگلی بیر اور دوسرے میوہ دار جنگلی درخت کسی کی ملکیت نہیں ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح نہ تو پتھر ،اور ڈنڈا (آلاتِ پیداوار) کسی کی ذاتی ملکیت تھا اور نہ ہی فطرت میں آوارہ پھرنے والا شکار کا جانور کسی کے جھوک کا مویشی تھا۔ محنت مشترک تھی اور پیداوار (شکار) بھی مشترک ۔اس لیے اسے قدیم کمیونزم کا سماج بھی کہتے ہیں۔ ہزاروں برس تک انسان اسی سماج میں رہتا رہا۔

جب موڈ آف پروڈکشن گیدرر یا ہنٹرز (قدیم کمیونزم) والا تھا تو اس سماج میں نہ ریاست موجود تھی ،نہ قوم وجود میں آئی تھی ،اور نہ کوئی منظّم عقیدہ موجود تھا۔ ظاہر ہے کوئی فلسفہ، نظریہ اور تحریر ایجاد نہ ہوئی تھی اور نہ ہی خاندان کا ادارہ موجود تھا۔ قصور دماغ اور شعور کا نہ تھا بلکہ یہ سماج کے میٹیریل حالات تھے جنہیں اُس وقت نہ ریاست کی ضرورت تھی اور نہ اکاؤنٹ بک کھولنے کی حاجت تھی ۔اور نہ شجرہِ نسب کے لیے خاندان والے ادارے کی ضرورت تھی۔

سبط حسن اپنی کتاب '' ماضی کے مزار'' میں بہت اہمیت والی بات کرتا ہے:
"خضری دور کے آغاز پر قبیلے کی وحدت تو بدستور برقرار رہی بلکہ اور زیادہ مضبوط ہوگئی۔ البتہ قبیلے کے اندر عورت کی حیثیت ضمنی ہوگئی۔ یہ دور جنگلی جانوروں کے شکار کا دور تھا۔ کیونکہ اب انسان پتھر کے نوکیلے ٹکڑوں کو لکڑی سے جوڑ کر کلہاڑے اور بھالے بنانے لگا تھا۔ جنگلی جانوروں کا شکار بڑے جان جوکھم کا کام تھا۔ اس میں جسمانی طاقت زیادہ درکار ہوتی تھی لہذا یہ کام مردوں کے سپرد ہوا۔ دراصل اسی وقت سے معاشرے میں تقسیمِ کار کی بنیاد پڑی"۔

2۔غلام داری سماج

رفتہ رفتہ اُس خاص جغرافیائی علاقے میں آبادی بڑھتی گئی ، شکار کم پڑتا گیا اور اس کا حصول مشکل بنتا گیا۔ تب ایک شکاری قبیلے نے دوسرے شکاری گروہ کو قتل کر کے اُس کا شکار چھین لیا۔ مگر، اجتماعی تجربے کر کر کے آگے چل کر انہیں احساس ہوا کہ مغلوب گروہ کے آدمیوں کو بے فائدہ قتل نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ انہیں قتل کرنے کے بجائے اُن کو اپنا غلام بنایا جائے تا کہ وہ اُن کے لیے جا کر شکار کر لائیں۔ یہ ہے غلام دارانہ سماج۔

یہاں آقا غلاموں کا استحصال کرتے تھے۔ وہ غلاموں کی محنت کی پیداوار کو اپنی ذاتی عیاشی میں صرف کرتے تھے۔ وہ غلاموں سے شکار کرواتے تھے، ہل چلواتے تھے، اور جنگوں میں لڑواتے تھے۔ اس عہد میں چین ، ہندوستان، مصر، اٹلی، یونان ، روم اور وسط ایشیا میں غلاموں سے نہریں، سڑکیں ، پل ، قلعے اور محل تعمیر ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ کان کنی میں غلام جھونکے جاتے رہے۔ لوہا، سونا اور چاندی کی کانوں میں غلام ہی کام کرتے تھے۔ غلام سونا چاندی کھودتے اور آقاؤں کے لیے عظیم الشان محلات تعمیر کرتے ۔ وہ قلعے اور مندر بناتے ۔ اہرام مصر انہی غلاموں کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ روم کی سپر پاوری اسی غلام داری کے بدولت تھی۔

غلاموں کی محنت سے پیدا شدہ عظیم پیداوار کا معمولی حصہ ذرائع پیداوار کی ترقی کے لیے خرچ کیا جاتا تھا۔ مگر اس عہد میں تباہ کن جنگوں کے نتیجے میں پیداواری قوتیں بار بار تباہ ہوتیں، شہر اور بستیاں اجڑ جاتیں۔ قدیم یونان ایسی جنگوں کی تاریخ سے بھرا پڑا ہے۔ رومن ایمپائر کی تاریخ کا بھی یہی حال ہے۔

بس ایک کام بڑھتا گیا۔ غلاموں کی خرید وفروخت ترقی کرتی گئی۔ بلکہ اب کچھ خاص مفتوحہ علاقے غلام حاصل کرنے کا مستقل ذریعہ بنا دیے گئے۔ غلاموں کی تجارت کی بڑی بڑی منڈیاں قائم ہوئیں۔

ریاست، فلسفہ، دھرم، خاندان، اور تحریر تو بہت بعد میں جا کر، سرف ڈم کے زمانے میں نمودار ہوئے۔ اس لیے کہ اب مویشیوں کی تعداد جیسی چیزوں کا ریکارڈ رکھنے کی ضرورت پڑی۔ یہیں غلام داری سماج ہی میں یہودیت والا مذہب پیدا ہوا۔ جس میں عوام الناس کو صبر و قناعت اور عدم تشدد کی تلقین کی جاتی تھی۔ اچھا غلام بننے کی ہدایت۔ آقا اور غلام کا دور، بادشاہ اور رعیت کا دور، اور محتاج اور مخیّر کا دور۔

3۔ فیوڈلزم

زمان کی بیکراں وسعتوں میں انسان، بالخصوص عورت نے کاشتکاری دریافت کی۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ اگر پھل یا بیج زمین میں دھنس جائے یا ڈالی جائے تو پھل یا فصل حاصل ہو سکتی ہے۔ نتیجے میں پندرہ بیس ہزار سال قبل بڑے پیمانے کی کاشتکاری وجود میں آئی۔ اور سماج بڑھتے بڑھتے فیوڈلزم والا بن گیا۔

اس لیے کہ انسان رفتہ رفتہ جنگلات صاف کر کے قابلِ کاشت زمین کو وسیع بناتا گیا، اور پھر اُس کی ملکیت بھی چند لوگوں کے ہاتھ آئی۔ یوں زمین اور آلاتِ پیداوار نجی ملکیت میں جاتے گئے۔ اس کے علاوہ اب انسان پتھر کے آلاتِ پیداوار کی جگہ دھات کے آلات بنانے لگا تھا۔ اور پھر مہر گڑھ میں پہیہ بن گیا۔ یوں اُس کی قوتِ محنت بہت بڑھ گئی۔ دھونکنی کی ایجاد نے لوہار کو اس قابل بنا دیا کہ وہ لوہے کے مضبوط اوزار بنا لے۔ لوہے کی کلہاڑی انسان کے ہاتھ میں ایسا ہتھیار آ گیا جس سے وہ جنگلوں کو صاف کرنے کے قابل ہو گیا۔ اور لوہے

کے پھالے کی مدد سے لکڑی والے ہل کے مقابلے میں زیادہ بڑی زمین کے قطعات کو زیرِ کاشت لایا۔ اس نے اب جنگلی جانوروں کے شکار سے خوراک حاصل کرنے کا کام چھوڑ کر بڑے پیمانے کی کاشت کاری اختیار کی۔

ساتھ میں وہ مویشی بھی پالنے لگا۔ یوں اُس کی زرعی پیداوار بڑھی۔ اس نے اب فصلوں کی ورائٹی بھی بڑھا دی۔

اب باقاعدہ دو طبقے بن گئے: زمین کا مالک طبقہ اور بے زمین کسان طبقہ۔ مالک نے کسان کو قابو میں رکھنے کے لیے ڈنڈے مار قسم کے لوگ رکھے۔ کوئی جادوگر، نجومی، دم چُھو کرنے والا پکڑ کر دربار میں بٹھا دیا۔ ایک آدھ شاعر، اور ایک آدھ قاضی بھرتی کیا۔ کچھ اور شعبوں میں بھی اس نے کرائے کے آدمی رکھے۔ یہیں سے ریاست کا آغاز ہوا۔

دولت مند جاگیردار مزید دولتمند ہونے لگا۔ اس کی مویشیوں کے ریوڑ بڑھنے لگے۔ ساتھ میں کپڑا بُننے اور دھات کے آلات بنانے کا فن بھی ترقی کرتا رہا۔

ارتقا اور ترقی ہوتی گئی۔ سرف ڈم تو اس لیے تھا کہ آلاتِ پیداوار فرسودہ تھے۔ آلات میں ترقی ہوئی تو کسان کا درجہ بھی بلند ہوا۔ سرف ڈم ختم ہوئی اور کسان فروخت ہونے سے آزاد ہوا۔ وہ رہا تو کسان ہی، مگر اب مالک چُننے کی اُسے آزادی ملی۔

فیوڈل ازم کا غالب مذہب مسیحیت تھا۔ چرچ، پوپ، بادشاہ اور جاگیردار کی اطاعت اس مذہب کا خاص پیغام تھا۔ شیولری، غیرت و آنر، اور وفاداری یہاں ویلیوز کے بطور راسخ ہوئے۔

medieval (5ویں سے 15ویں صدی تک) کا یہ زمانہ یورپ میں تاریک ترین دور رہا ہے۔ اس میں فرد کو کوئی آزادی نہیں تھی۔ سماج چرچ، بادشاہ اور فیوڈل لارڈز کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ معاشرہ سماجی، مذہبی اور سیاسی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ تخلیقی عمل رک چکا تھا۔ یورپ معاشی طور پر خستہ حال تھا۔ مسیحیت یعنی چرچ اور پادری، عوام کو ریاست کے ظلم کو صبر سے برداشت

کرنا سکھاتی تھی۔ مسیحیت سے علیحدہ ہر مذہب اور رویہ کو طاقت کے زور پہ دبایا گیا ۔اس مشن کے تحت چرچ نے پورے یورپ سے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو زبردستی مسیحی بنانا شروع کیا اور جو نہیں مانتے انہیں یا تو قتل کیا، زندہ جلا دیا، یا جلاوطن کر دیا۔

عورتوں کے ساتھ اس سے بھی خطرناک رویہ اپنایا گیا۔ پادریوں نے عورتوں کی زیب و زینت و آرائش پہ حملہ کر دیا۔ عورت کا جسم اور اس کا لباس ان کے وعظوں کا اہم موضوع بن گیا، عورت کو جنسی اعضا کے طور پر حقارت کی نگاہ سے پیش کیا گیا۔ سمجھدار اور چرچ کی بدعنوانیوں کے خلاف بولنے والی عورتوں (آوازوں) کو ڈائن، اور شیطان کا ساتھی یا پھر گمراہ قرار دیا۔

کنفیشن کے عمل کے ذریعے چرچ کی طرف سے افراد کی نجی زندگی میں مداخلت شروع ہوگئی تھی اور ہر مسیحی کے لیے یہ ضروری ٹھہرا کہ کم از کم سال میں ایک مرتبہ اپنے علاقے کے پادری کے سامنے اپنی گناہوں کا اعتراف کرے۔ اس اعترافات کے نتیجے میں پادری نے افراد کے اُن معاملات میں بھی دخل دینا شروع کیا جو بہت زیادہ نجی تھے۔ اب چرچ سیاسی طور پر اتنا مظبوط ہوا تھا کہ بادشاہ کی تاج پوشی کی رسم بھی چرچ میں ادا ہوتی تھی۔

چرچ نے اپنے مذہبی اور سیاسی تسلط کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو دبانے کے لیے انکویزیشن کا محکمہ بنایا تا کہ منحرفین جو چرچ اور ریاست کے لیے خطرہ ہوں انہیں سزا دی جائے۔ ان سزاؤں میں اذیت دینا، جلا وطن کرنا، جائداد ضبط کرنا، زندہ جلانا اور موت کی سزا شامل تھی۔ انکویزیشن ادارے کا کام یہ تھا کہ ریاست اور چرچ کی بدعنوانیوں اور غلط پالیسیوں کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو دبائے اور آگاہی کو روکے۔

جب جرمنی میں پرنٹنگ پریس مشین ایجاد ہوئی تو یہ گویا دنیا کی تاریخ میں ایک انقلاب تھا۔ تب کتابیں زیادہ چھپنے لگیں لوگ زیادہ پڑھنے لگے۔ بائبل کا بھی مقامی زبانوں میں ترجمہ ہونے لگا۔ اب لوگوں کو بائبل سمجھنے کے لیے چرچ کے کسی پادری کا محتاج نہیں بننا پڑتا۔ اس طرح یورپ میں ترسیلِ علم تیز ہوگیا۔ چرچ کے خلاف جب آوازیں اٹھنے لگیں تو 1530 میں انکوزیشن نے اپنے دائرہ عمل میں دانشوروں اور تعلیمی درسگاہوں کو بھی لے لیا۔ یونیورسٹی کی تعلیم، نصاب کی

کتابیں اور پروفیسروں کے خیالات کی نگرانی ہونے لگی۔ یونیورسٹی میں لکچر ہال کے برابر والے کمرے میں انکوزیشن کا عہدیدار پروفیسر کا لکچر سنتا تھا تا کہ پروفیسر ایسے خیالات کا اظہار نہ کرے جو کہ چرچ کی تعلیمات کے خلاف ہوں۔ پرتگال کے طالبعلموں کو تعلیم کے لئے دوسرے ملکوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن اور کئی دوسرے ریسرچرز کی کتابیں ممنوع تھیں۔ کتابوں کی اشاعت سے پہلے چرچ کے عہدیدار اس کی چھان بین کرتے، چرچ کی اجازت کے بغیر کوئی کتاب، میگزین یا تحریر نہیں چھپ سکتی تھی۔

چرچ اور ریاست کے اس قدر گھٹن زدہ ماحول میں لوگوں کا سانس لینا مشکل ہوگیا تھا۔ لوگ تنگ آ چکے تھے۔

4۔ کیپٹلزم

یہ سب وہ محرکات تھے جنہوں نے ''رینے ساں'' کو جنم دیا۔ رینے ساں وہ زمانہ تھا جب چرچ اور ریاست کی بربریت کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں۔ اصلاحی اور ہیومنسٹ تحریکیں شروع ہوئیں اور آہستہ آہستہ روشن خیالی، اور فرد کی آزادی کے حق میں آوازیں تیز ہونے لگیں۔ بغاوت کی یہ تیز و طرار آواز پورے یورپ میں گونجنے لگی اور فرانس میں انقلاب کے بعد یورپ کی دوسری ریاستوں نے دباؤ میں آ کر ہیومنسٹ تحریکوں اور اصلاحات کو تسلیم کیا۔ اس طرح لوگوں کو چرچ اور بادشاہ کے ظلم و ستم سے آزادی ملی۔۔ بادشاہ، اور چرچ کا تسلط ختم ہوا، اور فرد کی آزادی بحال ہوئی۔ اب لوگوں کا رجحان معیشت پر ہوا۔ اس کے لیے انہوں نے مختلف راستہ ڈھونڈنا شروع کیا۔

دراصل فیوڈلزم ہی کے دوران ترقی یافتہ آلات کے لیے دستکاروں کا اپنا گروہ، ورکشاپ اور دیہی مارکیٹ وجود میں آتی گئی۔ یوں شہر اور دیہات کا تصور سامنے آیا۔ یعنی اب دستکاری اور زراعت کی علیحدہ علیحدہ نشوونما ہونے لگی۔ اس تقسیم کے نتیجے میں تبادلے کے لیے پیداوار

کی جانے لگی۔یعنی اب اشیا ذاتی استعمال کے ساتھ ساتھ تبادلے کے لیے بنائی جانی لگیں۔اب سرکاری واجبات کی ادائیگی کے لیے بھی اجناسِ پیداوار کا ایک حصہ منڈی میں لے جانا پڑتا تھا۔

آلات پیداوار ہاتھ سے بنانے کے بجائے اوزاروں (مشینوں) سے بننے لگے تو دستکاروں کی ورکشاپوں کی جگہ انڈسٹری نے لے لی۔یہی انڈسٹری دراصل فیوڈلزم کے خاتمے کا آغاز بھی تھی۔ اس لیے کہ اب انڈسٹری خود سے ایک حقیقت بنتی گئی۔

لیکن جاگیرداری سماج خود بخود یعنی آٹومیٹک انداز میں انڈسٹری میں تبدیل نہیں ہوئی بلکہ اس کے لیے انڈسٹری والے علاقوں، یعنی شہروں نے فیوڈلزم کو زور زبردستی سے پچھاڑ دیا۔۔۔۔انڈسٹریل انقلاب لاکر،اور بڑے پیمانے کی کشت وخون سے گزر کر ہی ایسا ہوا۔ یہ کام صنعتی یورپ میں ہوا۔ یہ انقلابات اس لیے ضروری تھے کہ ترقی یافتہ آلاتِ پیداوار اب اس سماج میں سما نہیں سکتے تھے۔اب چونکہ کسان اور جاگیردار کے بجائے صنعتکار اور مزدور ایک الگ موڈ آف پروڈکشن (طریقِ پیداوار) بن چکے تھے۔اس لیے آخری ہلّہ بولنا ہی تھا۔

صنعتی انقلاب کا سیٹی بجانے والا ملک انگلینڈ تھا۔صنعتی انقلاب کا سب کچھ وہیں ہو رہا تھا۔یعنی 18ویں صدی کے وسط تک برطانیہ سب سے بڑی کمرشل قوم تھی۔گلوبل ٹریڈنگ ایمپائر انگلینڈ کپٹلزم کی جنم بھومی ہے۔

انیسویں صدی سے قبل ہمارا پورا معاشرہ فیوڈل اور ماقبل فیوڈل سماجی رشتوں میں تھا۔اسی طویل فیوڈلزم کے دوران:

1۔دستکاریاں ترقی کرنے لگیں۔دستکاری نے قصبے بنائے۔یہ قصبے غلام داری میں بنے۔یہ قصبہ ہوتے ہوتے دیہات سے الگ ہوگیا۔پن چکی،لوہے کے استعمال،اور کپڑا بُننے میں ترقی نے مل کر شہری آبادی کی بنیادیں رکھی تھیں۔دستکاریاں بھی وہیں مرکوز ہوئیں اور تجارت بھی۔

2۔اسی طرح زراعت میں ترقی ہوتی رہی۔نئے پھل اور اناج ایجاد ہوتے گئے،اور جانوروں کو سدھا کر بار برداری اور ٹرانسپورٹ کے بطور استعمال کیا جاتا رہا۔

3۔اسی اثنا میں یورپ کے اندر 16ویں سے 18ویں صدی تک ٹکسٹائل انڈسٹری نے ایک ایسا نظام تشکیل دیا جس میں پیداواریت بڑھانے کے لیے جمع شدہ کپٹل کی سرمایہ کاری کی گئی۔۔۔اسے کپٹلزم کہتے ہیں۔یعنی جو نیا صنعتی نظام پیداوار بنا اس کو کپٹلزم کہتے ہیں۔

1750 سے لے کر 1850 تک کے برطانوی انڈسٹریل ریولیوشن میں دنیا عجب انداز میں تبدیل ہوتی رہی۔وہاں انڈسٹریل ریولیوشن کی نمایاں ترین چیز یہ تھی کہ دستکاروں کی کارگاہوں کی جگہ اب مشینیں لینے لگیں۔انڈسٹری میں لیبر کی تعداد بڑھتی گئی،کپٹل انوسٹمنٹ ہوتا رہا، پیداوار ہاتھ کے بجائے مشین کے استعمال کی بدولت بہت ہونے لگی۔ٹکسٹائل انڈسٹری سب سے زیادہ منافع بخش ہوتی گئی۔پانی کی اپنی قوت اور اُس سے بنائی جانے والی بھاپ کی طاقت کو صنعت میں استعمال کیا جانے لگا،اب ایسی بڑی فیکٹریاں بننے لگیں جو مشینیں تیار کرتی تھیں۔اسی طرح انڈسٹریل ریوولیوشن میں نہری نظام نے زراعت کی بارانی اور فرسودہ طرز ہائے آبپاشی پہ حاوی ہونا شروع کیا،زراعت میں کیمیکل اشیا کا استعمال بڑھتا گیا،لوہے کا استعمال بڑھتا گیا۔سمندروں میں بھاپ سے چلنے والے جہاز،مال لانے لے جانے لگے،مست توکلی کو حیران کردینے والا ریلوے قائم ہوکر بلوچستان تک آیا،اور اطلاعات کے لیے ٹیلیگراف آیا۔

شہر،بلا کی طرح ابھرنے لگے،دیہات شہر کے پیٹ میں بھی جاتا رہا،اور شہر کا پیٹ بھرتا بھی رہا۔بکھری آبادی مرتکز ہونے لگی۔

یوں،اِن تینوں مظاہر نے مل کر بلوچستان سمیت دنیا بھر میں فیوڈل ازم کو بالآخر کہیں مکمل طور پر اور کہیں جزوی طور پر توڑ دیا۔اور کپٹلزم اس کی جگہ گھیرنے لگا۔یوں،داخلی طور پر یہاں وہاں کچھ سرداریاں وڈیرہ گیریاں رہ گئی ہوں گی مگر مجموعی طور پر فیوڈل اور ماقبل فیوڈل سماج

''زَربُردْ'' ہوکر عالمی کپٹلزم کی ٹرین کے ساتھ اپنی بوگی لگا چکا۔

مطلب یہ کہ انسان بیر چُننے اور بعد میں زراعتی معاشرے سے ہوتے ہوئے دھاتوں کے استعمال سے تاجر اور دستکاروں میں بدل کر، پھر سٹیم انجن اور موٹر کے استعمال سے بزورِقوت فیوڈلزم اور بادشاہت ختم کر کے حال ہی میں کپٹلزم میں داخل ہونے کی ہزاروں برسوں کی تاریخ رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا ایک فقرے سے ہی اندازہ ہونا چاہیے کہ باہر سے نہیں سب کچھ سماج کے اندر سے جنم لیتا رہا۔ ایک نفی جس نے بلوغت پہ اپنے پورے فریم ورک کو نفی میں بدل ڈالا۔ مگر بہ یک وقت اپنی کھوکھ میں اپنی ہی نفی کے نطفے کو پالنے بھی لگا۔ یہ جو نطفہ ہے یہ دراصل پیداوار کے ٹولز ہیں جو جوان ہوتے ہیں تو اپنے فریم یعنی پیداواری رشتوں کو تتر بتر کر دیتے ہیں اور اپنی مطابقت میں نئے پیداواری رشتے قائم کرتے ہیں۔

آج ہم ترقی یافتہ کپٹلزم نامی پیداواری رشتوں میں زندہ ہیں۔

چونکہ مشینوں سے واسطہ تھا اس لیے تعلیم (ٹکنیکل تعلیم) مشین پر کام کرنے والے ہر مزدور کے لیے ضروری ہوگیا۔ اسی لیے جگہ جگہ ایسے سکول، کالج اور ٹریننگ سنٹرز سرکاری طور پر کھول دیے گئے۔

''پیسہ کپٹل اُس وقت بنتا ہے جب اس کی مدد سے دوسرے یا دوسروں کی قوتِ محنت خریدی جائے''۔ اور جن لوگوں کے پاس کپٹل ہوتا ہے انہیں کپٹلسٹ کہا جاتا ہے۔ جب بھی قوتِ محنت بطور کماڈٹی بکے تو سمجھو کپٹلزم ہے۔ اس میں مزدور کو معاوضہ بس اتنا ملتا ہے جس سے وہ خوراک، پوشاک اور دوسری انتہائی بنیادی چیزیں خرید سکتا ہے۔ لیکن اپنے اس بیچے ہوئے وقت سے وہ جو اشیا پیدا کرتا ہے اس کی قیمت مزدور کے معاوضے سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان دونوں کا فرق ''سرپلس ویلیو'' کہلاتا ہے۔

تو، کپٹلزم کیا ہے؟۔ یہ سرپلس ویلیو پیدا کرنے والا نظام ہے۔

معاشیات کا علم کب آسان رہا ہے۔ جاگیردار کی منشی گیری، اکاونٹس برانچ کی کلرکی، ضرب تفریق، پہاڑے، کلیے، بیجک، ورداس، قلم، بہی کھاتہ، رجسٹر....... اور پھر جوں جوں سماج آگے بڑھتا گیا تو کیلکولیٹر، اعداد وشمار، کمپیوٹر، رپورٹس، محکمہ معاشیات ۔۔۔ اور اب آئی ایم ایف، ڈبلیو ٹی او، ورلڈ بینک، گلوبلائزیشن، فری مارکیٹ، مارکیٹ فورسسز ۔۔۔ اتنا گنجلک شعبہ، اتنی پیچیدہ سائنس، اس قدر خوفناک کام ۔۔۔ اور صاحب علم کی انگلیاں، مونچھیں سگریٹ کے دھوئیں سے زردی مائل زنگ سے رنگے ہوئے، شیو بڑھی ہوئی، بال الجھے ہوئے یا پھر بے پناہ گنجاپن ۔۔۔ کس قدر خوفناک شعبہ ہے یہ۔

مگر اسی خوفناک شعبے میں تو 95 فیصد انسانوں کی غریبی کے منتر گھڑے جاتے ہیں، لکھے جاتے ہیں۔ انہی ضخیم رپورٹوں میں تو "معمولی سی انویسٹ منٹ کے "غیر معمولی منافع" کے گنڈے اور تعویذ لکھے جاتے ہیں۔ یہی بہی کھاتے تو قافلہ گیری کے سماج سے لے کر ترقی یافتہ کپٹلزم تک انبوہِ عظیم کی تقدیروں پہ سیاہی پھیرتے رہتے ہیں۔۔۔ اَن مٹ، دیرپا ابدی سیاہی۔

مگر ساتھ میں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ پچھلے سارے نظاموں کے مقابلے میں کپٹلزم پروگریسو ہے۔ اس لیے کہ یہ پرانے طریقِ پیداوار کو تباہ کرتا ہے اور پیداواری قوتوں کو ترقی دیتا ہے۔ کپٹلسٹ کلاس کے قبضے میں وسائل پیداوار یعنی مشینیں فیکٹریوں کی صورت میں ہیں۔ اب مال کی یہ پیداوار خود پہ استعمال کرنے کی بجائے مارکیٹ میں ایکس چینج کے لیے ہوتا ہے۔

یہ خاصیت اس کے استحصال کو گلوبل اور لامحدود بناتا ہے۔ یہ معیار زندگی بلند کرنے کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اس طرح وہ زیادہ سامان فروخت کر سکتا ہے۔ یہ فری مارکیٹ کو بڑھاوا دینے کے لیے ڈیموکریسی کی مدد کرتا ہے۔

کپٹلزم مزدوروں کو ترقی دیتا ہے، منظّم کرتا ہے۔ مگر یہ ترقی کرتے کرتے ایک سٹیج پہ

جا کر مزدوروں کو محکوم بناتا ہے اور غربت اور سٹرانڈ کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ پیداواری قوتوں کی نشوونما کو روک دیتا ہے۔ اور اس سٹیج پر پہنچ کر مزدور سرمایہ دار کے دشمن بن جاتے ہیں۔

کماڈٹی

جو پراڈکٹ ڈائریکٹ کھپت کے لیے نہیں بلکہ تبادلے کے لیے، یعنی مارکیٹ میں فروخت کرنے کے لیے تیار کی جائے اُس کو ''کماڈٹی'' کہتے ہیں۔ دنیا میں دستکاری اولین کماڈٹی تھی۔ ہر کماڈٹی کی ایک نہیں دو قیمتیں (ویلیوز) ہوتی ہیں۔ یا تو آپ اسے خود استعمال کرتے ہیں (یوز ویلیو)، یا پھر جا کر ''اُسے'' دے دیتے ہیں اور بدلے میں ''اُس سے'' اپنی ضرورت کی دوسری چیز لے آتے ہیں۔ (ایکسچینج ویلیو)۔

یوز ویلیو کو ذرا قیلولہ کرنے دیں اور آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ ایکسچینج ویلیو کو کون، کس طرح مقرر کرتا ہے۔

ایکسچینج ویلیو کو اُس کماڈٹی کی تیاری پر لگی ہوئی انسانی محنت مقرر کرتی ہے۔ یعنی آپ چھ گھنٹے لگا کر تیار کردہ اپنی کماڈٹی کو اپنی ضرورت کی اُسی کماڈٹی سے بغیر اضافی کچھ دیے ہوئے، تبدیل کرسکیں گے جس کی تیاری میں اگلے نے بھی چھ ہی گھنٹے صرف کیے ہوں۔ اس نظام کو بارٹر سسٹم کہتے تھے۔ بلوچی میں ''مٹ سٹ''۔ یہ نظام بہت زمانوں تک چلا۔ اور کماڈٹیز کا یہ توسیع شدہ ایکسچینج عام بن گیا تو ''کرنسی'' ابھری۔ کرنسی ایک یونیورسل کماڈٹی ہے جس سے باقی ساری کماڈٹیز کو جانچا جاتا ہے۔ یعنی کرنسی کماڈٹیز کے ایکسچینج کے اندر ایک بیچ والے عامل کا کام دیتا ہے۔ اب ہر کماڈٹی کی قیمت کرنسی میں طے ہوتی ہے۔

پیچیدہ بات تو پیچیدہ رہتی ہی ہے۔ آپ کو لتا منگیشکر کے کسی مست گانے میں بھی

لپیٹ کر سنا دیے جائیں تب بھی اگلے دو پیراگراف سادہ نہیں بن سکتے۔ اس لیے دماغ کے آستین چڑھایئے اور پڑھنا شروع کیجیے: ایک کارخانہ دار مارکیٹ میں روزانہ 500 روپے گز کے حساب سے کپڑا بیچتا ہے۔ اس میں سے وہ مزدور کو دن کے چھ گھنٹے کام کرنے کے اجرت کے بطور 100 روپے دیتا ہے۔ وہ اس کپڑے کا خام مال خریدنے میں 50 روپے مزید خرچ کرتا ہے۔ یہ بھی شامل کیجیے۔ خرچہ بنے گا 150 روپے۔ اب مشین کی قیمت، مرمت، ایندھن وغیرہ کا خرچہ 50 روپے ملالیں تو اب یہ سارا ہوگیا 100+50+50= 200 روپے۔ یعنی 200 روپے آ گیا خرچہ۔ اب مالک یہ کپڑا 500 روپے کا بیچے گا۔ یعنی 300 روپیہ منافع۔

ذرا گڑ بڑ دیکھیے۔ دراصل مزدور نے اپنے 100 روپوں جتنا کام چھ گھنٹے میں نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے 100 روپوں جتنا کام تو محض تین گھنٹے میں کرلیا تھا۔ باقی یہ جو اضافی تین گھنٹے کا کام اُس نے کیا وہ دراصل وہی 300 روپیہ ہے جو سرمایہ دار کی جیب میں جاتا ہے۔ مزدور کے پہلے تین گھنٹوں کو Essential Time (لازمی وقت) کہتے ہیں۔ دوسرے تین گھنٹے سرپلس ٹائم (زائد وقت) کہلاتے ہیں۔ اور اسی سرپلس ٹائم کی اجرت اُسے نہیں ملتی۔

اسی سرپلس ٹائم کی محنت کے نتیجے میں جو پیداوار ہوگی، وہ سرپلس پیداوار ہوگی، یعنی سرپلس ویلیو (قدرِ زائد)۔ جو کہ اُس کے نہیں بلکہ کپٹلسٹ کی جیب میں چلا جاتا ہے۔۔ جس میں اس نے مالک کو 300 روپیہ دلا دیا۔

سوال: اس سارے پیداواری پراسیس کے اندر مالک، خام مال، ایندھن، مشین، مزدور اور مارکیٹ میں سے سب سے ضروری عنصر کونسا ہوتا ہے؟۔

جواب: مزدور یعنی محنت۔

مزدور اپنا ''مال'' یعنی اپنی قوتِ محنت سرمایہ دار کو بیچ دیتا ہے۔ اسی محنت نامی کماڈٹی

سے قدرتی خام مال، کماڈٹی بن جاتا ہے۔ اگر مشینری سے اجرتی مزدوروں کا سارا طبقہ ختم کیا جائے، تو یہ کپٹل کے لیے کس قدر خوفناک بات ہوگی۔ اس لیے کہ اجرتی مزدور کے بغیر تو یہ کپٹل رہے گا ہی نہیں۔

جاگیرداری نظام میں موجود کھیت کے مزدور کو انگلش میں سَرف (Serf) کہتے ہیں۔ وہ سَرف زندگی بھر جاگیردار کی ملکیت ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف صنعتی مزدور اپنی پوری زندگی کو کپٹلسٹ کے ہاتھ فروخت نہیں کرتا۔ بلکہ وہ روزانہ اپنے آٹھ، دس، یا بارہ پندرہ گھنٹے نیلام کرتا ہے۔ جو صنعتکار زیادہ بولی دے گا، وہ اپنے یہ گھنٹے اُسی کو بیچ دے گا۔ یعنی فیوڈلزم کے برعکس کپٹلزم میں مزدور سرمایہ دار کی ملکیت نہیں ہوتا۔ دراصل وہ کسی بھی سرمایہ دار کی ملکیت نہیں ہوتا۔ اس کے تو روزانہ کے ''صرف'' وہی آٹھ دس گھنٹے اُس شخص کی ملکیت بن جاتے ہیں جو انہیں خرید لے۔ اس لیے جاگیرداری زمانے کے سرفوں کے برعکس صنعتی مزدور جب چاہے اپنے سرمایہ دار کو چھوڑ دیتا ہے اور کسی نئے سرمایہ دار کے ہاتھ اپنے آٹھ گھنٹے فروخت کرتا ہے۔

چونکہ مزدور کے گذر بسر کا واحد ذریعہ اپنی محنت کو بیچنا ہے، لہذا وہ خریداروں کے پورے طبقے، یعنی سرمایہ دار طبقے کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ گو کہ وہ کسی ایک یا دوسرے سرمایہ دار کی ملکیت نہیں ہے، مگر وہ پورے سرمایہ دار طبقے کی ملکیت ضرور ہے، وہ اسی سرمایہ دار طبقے کے اندر ہی کوئی نیا گاہک تلاش کرتا رہتا ہے۔

کپٹلزم میں اگر کپٹل مزدور کو کام نہ دے تو مزدور مر جائے گا۔۔۔ مگر پھر کپٹلزم بھی مر جائے گا۔ اسی طرح اگر کپٹلزم ''مزدور'' کی قوت کو استعمال نہ کرے تو کپٹلسٹ مر جائے گا۔ اور پھر کپٹلزم بھی مر جائے گا۔ لہذا یہ تو بالکل بھی نہیں ہوسکتا کہ کپٹلزم مزدور کے بغیر چلے۔ اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ کپٹلزم کپٹلسٹ کے بغیر چلے۔

پیسہ آتا کہاں سے ہے؟

ہم نے دیکھا کہ سرپلس ویلیو ناجائز ہے۔ اس لیے کپٹل بذاتِ خود ناجائز ہے۔ جب کپٹلسٹ کی ساری بنیاد ناجائز ہے تو اس کا سارا نظام ''ناجائزات'' اکٹھا کرنے والا نظام ہوا۔ یعنی کپٹلزم رشوت، سفارش، ٹیکس چوری، کمیشن، کک بیک، بجلی اور گیس چوری، اور سمگلنگ کا ملغوبہ نظام ہے۔ کپٹلسٹ کا پیسہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

ہم تین چار اور ذرائع بھی گنوا سکتے ہیں جن سے اس کی تجوری پھولتی جاتی ہے۔

* کپٹلسٹ اپنی مشینوں کی کارکردگی بہتر کرتا جاتا ہے۔ یوں زیادہ مزدور رکھنے کے بجائے اب وہ ایک ہی مزدور سے زیادہ مشینیں چلواتا ہے۔ اس طرح وہ مزید سرپلس ویلیو بٹورتا جاتا ہے۔

* اسی طرح وہ ہر وقت اس بات کی تاک میں رہتا ہے کہ کس طرح وہ اپنے کارخانوں میں کام کرنے والوں کی اجرتیں کم کرے۔

* ایک اور معاملہ یہ ہوا کہ مغربی یورپ کے ممالک جو کہ صنعتی انقلاب کا پنگھوڑا تھے، زبردست رفتار اور مقدار سے ترقی کرتے گئے۔ جبکہ غیر مغربی، اور دیر میں کپٹلزم قبول کرنے والے ممالک کی ترقی سست رہی۔ یوں آج کپٹلزم دو حصوں میں ہے: ڈِولپڈ کپٹلزم اور ڈِولپنگ کپٹلسٹ ممالک۔ مگر چونکہ کپٹلزم ایسا سانپ ہے جو اپنے بچے کھاتا رہتا ہے۔ اس لیے ترقی یافتہ کپٹلسٹ ممالک ترقی پذیر کپٹلسٹ ممالک کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان جیسے ڈولپنگ کپٹلسٹ ممالک کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے: استحصال ہوتے رہنا۔

کیسے؟ ترقی یافتہ کپٹلسٹ مالک ڈولپنگ کپٹلسٹ ملکوں سے خام مال سستا خریدتے رہتے ہیں۔ یعنی یہ ایک اور سورس ہوتا ہے پیسہ بچانے اور کمانے کا۔

ایک اور کام وہ یہ کرتے ہیں کہ جب اُس ترقی پذیر کیپٹلسٹ ملک کے خام مال سے پراڈکٹ تیار ہوتا ہے تو وہ اُس پراڈکٹ کو اُسی خام مال والے ملک کو مہنگا بیچتے ہیں۔ اِس گراں فروشی میں انہیں مزید پیسہ حاصل ہوتا ہے۔

اِن سارے اقدامات سے وہ ترقی پذیر کیپٹلسٹ ملک غریب ہوتا جاتا ہے۔ اور بالآخر معاشی طور پر محتاج، منحصر اور مفلوج ہو جاتا ہے۔ تب یہ ڈویلپڈ کیپٹلزم والا ملک اُس غریب سے اپنا اسلحہ خرید واتا ہے، پڑوسیوں سے اُس کی جنگیں کرواتا ہے۔ نیز وہ اُسے قرضے دے دے کر اچھی طرح پھنسالیتا ہے۔ اور یوں اُس کے داخلی اور خارجی امور کے فیصلے اپنی مرضی سے چلواتا ہے۔

ڈویلپڈ کیپٹلزم اِس سارے کھیل کے کھلاڑی کو امپیریلزم یا سامراج کہتے ہیں۔

* سرپلس ویلیو کا نظام اجرتوں کی کمی کے نفاذ کے لیے ایک اور اقدام بھی کرتا ہے۔ وہ اپنا کارخانہ ہی اکھاڑتا ہے اور اُسے غریب ممالک میں لے جا کر لگاتا ہے۔ جہاں بے روزگاری کی وجہ سے مزدور کم ترین اجرت پہ بھی کام کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُسے وہاں کی ریاست زمین مفت، ٹیکسوں میں چھوٹ اور دیگر بے شمار رعایتیں دیتی ہے۔ آج کا چین اس کی مثال ہے۔ مغربی کیپٹلسٹ دنیا نے انہی حالات و شرائط پہ آٹو موبیل، الیکٹرانکس، انفارمیشن ٹکنالوجی اور انفراسٹرکچر سے وابستہ اپنے سارے کارخانے اپنے ممالک سے اکھاڑ کر چین منتقل کر لیے۔

***

ہم نے دیکھا کہ کماڈٹی کی پیداوار رفتہ رفتہ اپنی ضرورت سے زائد ہو کر باہر بیچنے یا تبادلہ کرنے کے لیے ہونے لگی۔ جس جگہ یہ خرید و فروخت ہونے لگی وہ جگہ منڈی، پڑی، یا، مارکیٹ بن گئی۔

۔۔۔اور پھر یہ مارکیٹ طاقتور ہوتی گئی۔ انفرادی کیپٹلسٹوں نے بالخصوص یورپ

میں مارکیٹ پہ حاوی ہونے کے لیے کمپنیاں بنالیں۔ مزید منافع بٹورنے کی خاطر اُن کمپنیوں نے آپس میں مقابلے کیے، ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کیں، لڑائیاں کیں۔ موٹی کمپنی نے کمزور کو کھالیا، خرید لیا، یا خود میں ضم کر لیا۔ اور بالآخر ملکی سرحدوں سے باہر کی کمپنیوں سے الحاق کیے، مرجرز کیے اور یوں ایک زمانے کی مقامی کمپنی، قومی کمپنی بنتے بنتے ملٹی نیشنل اور ٹرانس نیشنل کمپنیوں کی شکل اختیار کر گئی۔

یہیں بس نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ٹرانس نیشنل کمپنیاں بھی، ایک دوسرے کے مقابلے میں منافع کے اندر فربہ ہونے کی تگ و دو میں لگی رہتی ہیں۔ حتی کہ وہ ایک دوسرے کو کھا جانے اور صفحہ ہستی سے مٹا ڈالنے لگیں۔ چنانچہ کیپٹلسٹ دنیا کا ایک قانون ''انضمام، اور، مرجر'' ہے (اب تو میگا مرجر)۔ ہم روز دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ ایک میڈیا ہاؤس دوسرے کو اپنے اندر جذب کرتا ہے، دوائیوں کی ایک کمپنی دوسری کو کھا جاتی ہے، اور ایک آئل ٹرانس نیشنل کمپنی دوسری کو خریدتی رہتی ہے، اپنے میں ضم کرتی رہتی ہے۔ کمہنیوں کا یہ مرجر روزمرہ کی بات ہے۔

یوں سرمایہ (کیپٹل) تعداد میں بہت انسانوں سے چھنتا گیا اور کم ہوتے ہوتے چند ہاتھوں میں جمع ہوتا گیا۔

دولت کا ارتکاز ہوتے ہوتے اب تو صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ دنیا میں جتنی بھی دولت پیدا ہوتی ہے اُس سب کے 82 فیصد کے مالک صرف ایک فیصد لوگ ہیں۔

کیپٹلزم سرپلس ویلیو نامی نشے کا نشئی نظام ہے۔ کیپٹل شراب ہے۔ نشے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ یہ جلد اتر جاتا ہے اور اسے پھر تازہ کرنا پڑتا ہے۔ شراب شراب ہوتی ہے، یہ آبِ حیات نہیں کہ آپ نے ایک آدھ گھونٹ پی لیا اور جنم جنم جی لیے۔ شراب (سرپلس ویلیو) کو، تو لمحہ لمحہ پینا ہوتا ہے۔ یہ ہر ہر ساعت میسری مانگتا ہے، ہر ہر گھڑی مسلسل سپلائی چاہتا ہے۔

نہ صرف یہ کہ اس کی مسلسل ترسیل چاہیے، بلکہ ہر روز ڈوز بڑھاتے جانا ہے۔ نشے

کی خاصیت ہے یہ۔۔۔۔یعنی؟۔یعنی سرپلس ویلیو ہر دم ملتا رہے اور زیادہ مقدار میں ملتا رہے۔

کیپٹلزم پہاڑوں کو روندنے کی قدرت رکھتا ہے۔یہ خوفناک بپھرے دریاؤں کو ڈائینو ساری ڈیم بنا کر روکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔مہیب سمندر اُس کے سامنے اتنا شانت کہ اپنی پیٹھ اُس کے ہزاروں ٹن وزنی بحری جہازوں کو براعظموں تک سواری بننے کے لیے ہمہ وقت حاضر باش کرتا ہے۔کوئی طبعی جغرافیائی رکاوٹ اس کے سامنے نہیں ٹک سکتی۔

ہم نے دیکھا کہ سرپلس ویلیو، کیپٹلزم کی ماں ہوتی ہے۔اُس گود کا عادی ضدی بچہ انسانیت، حب الوطنی، دین دھرم، اور نام نہاد اخلاقیات کو نہیں مانتا۔اس لیے کیپٹلسٹ نظام کا جو حکمران زیادہ محبِ وطن بننے کی باتیں کرے سمجھو کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔مارکیٹ کی نگاہ میں قوم پرستی اس لیے شیطانیت ہے کہ قوم پرستی وسیع منڈی کے سامنے قومی سرحد نامی رکاوٹ ڈالتی ہے۔اس لیے مارکیٹ نظام کا جو جنرل مشرف قوم قوم، اور ''پہلے پاکستان'' بولے سمجھو بہت اُستادی کر رہا ہے۔

کیپٹلزم عقیدے کے نام پر بھی اپنی منڈی کو محدود رکھوانے نہیں دیتا۔اسی لیے کیپٹلزم نہ یہودی ہوتا ہے اور نہ مسلمان۔مگر وہ مذاہب کو استعمال خوب کرتا ہے۔ہم نے دیکھا کہ کیپٹلزم کا بیٹا ضیاء الحق جتنا زیادہ مذہب کی بات کرتا تھا، اتنا ہی زیادہ مارکیٹ کے مندر کا اس کا متولی پن ظاہر ہوتا جاتا تھا۔

کیپٹلزم تکبر نہیں کرتا، امتیاز نہیں کرتا۔اس کے ہاں نہ سیاہ فام تحقیری حیثیت رکھتا ہے اور نہ گورا افضل مقام کا مالک ہے۔اس کے لیے زبان، عقیدہ، رنگ، اور نسل کا امتیاز بیکار کی باتیں ہیں۔وہ ان سب سے بلند ہے۔

منافع کا ویٹیکن انسان کی جیب ہوتا ہے۔۔۔دنیا کے ہر انسان کی جیب۔کیپٹلزم جیب کی پوجا کرتا ہے۔وہ اُس وقت تک دوسرے کی جیب کی پوجا کرتا ہے جب تک کہ اسے

خالی نہ کر دے۔اور ایسا وہ عالمی طور پر خریداروں یعنی صارفوں کا کلچر لاگو کر کے کرتا ہے۔چنانچہ جس لفظ گلوبلائزیشن سے ہم آپ آشنا ہیں وہ دراصل کنزیومر کلچر کی گلوبلائزیشن ہے۔

چونکہ سرمایہ یا کیپٹل یا پیسہ نامی کیپٹلزم کی ماں، پوری دنیا میں جڑیں پھیلائے بکھری پڑی ہے۔اسی لیے کیپٹلزم اپنی ماں کی تانگ میں دنیا میں ہر جگہ پر حاضری بھرنے، اور ہر کونے سے روابط رکھنے پہ ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔

ہم امیر ہوں یا غریب، کالے ہوں یا گورے، ایشیائی ہوں یا امریکی، بلوچ ہوں یا عرب، سب ایک ہی عالمی نظام میں زندگی گزار رہے ہیں: سرپلس ویلیو کے نظام میں، سلطنتِ سرپلس ویلیو میں۔باقی ہم خواہ قذافی کی طرح ٹینٹ میں سو جانے کا ناٹک کریں یا واشنگٹن میں جا کر عبایہ میں آٹھواں عجوبہ بننے کی کوشش کریں، دراصل یہ سب کوششیں خود فریبی اور شوبازی ہے۔ایک آدھ ملک کو چھوڑ کر سارے آٹھ ارب انسان غلامانِ دربارِ مارکیٹ ہیں اور بس۔اور دربار میں تو بجا آوری ہوتی ہے، کوئی اکڑ، افتخار نہیں چلتے۔جو پھوں پھاں، یا جو ڈائیلاگ بازی صبح شام یہاں کی فیوڈل یونیورسٹیوں سے فارغ شدہ سیاست دان اور دانشور ٹی وی اور فیس بک پر کرتے ہیں، سب سطحی ہے۔کوئی نیل اور کاشغر کی پاسبانی دوہراتے دوہراتے ہمارے لُوٹے جانے کا بندوبست کر رہا ہوتا ہے، اور کوئی قومی افتخار چپتے چپتے عوام کی جیب کٹوا آتا ہے۔کیپٹلزم میں لٹنے سے استثنا کی سہولت کسی کو حاصل نہیں ہے۔کیپٹلزم کے ہزاروں ہاتھ ہیں، سینکڑوں پیر ہیں، درجنوں آنکھیں اور بیسیوں کان ہیں۔سرپلس ویلیو کی آماجگاہ کیپٹلزم کا، کوئی وطن، کوئی زبان، رنگ، نسل اور مذہب نہیں ہوتا۔وہ خود ہی یونیورس ہوتا ہے، انٹرنیشنل ہوتا ہے۔

کیپٹلزم سپرسونک رفتار سے رواں رہتا ہے۔یہ بہت حقارت سے نام نہاد سرحدیں توڑتا جاتا ہے، ریاستوں کی قوم پرستی کی گردن مروڑ کر اپنے لیے بڑی مارکیٹ تشکیل کر دیتا ہے۔ایک وقت تھا کہ بلوچستان میں اونٹوں کے کاروان سے ہر قبیلہ اپنے اندر سے گزرنے کا ٹیکس

لیتا تھا۔تصور کیجیے کہ سومیانی بندرگاہ سے لے کر ملتان تک جانے والے مال کاروان کس کس علاقے کے سردار کو ٹیکس دیتا ہوگا۔مگر اب کیپٹلزم ایسا کرنے نہیں دیتا۔مثلاً ریلوے ہر رکاوٹ کو کچلتے ہوئے اس کے مال کی ٹرانسپورٹ یقینی بناتا ہے،اس کے مال کے کنٹینروں کے لیے بین الاقوامی شاہراہیں حاضر ہیں۔دیوہیکل بحری جہاز اپنے کندھوں اور سر پہ اُس کے مال کے انبار لادے ایک براعظم سے دوسرے تک جاتے ہیں۔

اسی طرح مارکیٹ اور منافع ایسا نشہ ہوتا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے کاروباری معاملات اور منافع کی راہ میں رکاوٹیں اور مسائل دور کرنے کے لیے کارپوریشنوں کے منیجروں کو ضروری اور لگاتار ہوائی سفروں کے لیے تمام سہولتوں سے آراستہ ہوائی جہاز ہمہ دم حاضر باش ہیں۔سرپلس ویلیو وہ ڈریگن ہے جو جب چاہے مچھلی بن کے سمندر میں کلانچیں مارے ، جب چاہے زمین پہ فراٹے بھرے اور جب چاہے آسمان پہ دیوہیکل ٹرانسپورٹ جہاز بن جائے۔

کیپٹلسٹ امیر سے امیر تر بننے کے لیے ،اپنا اثر رسوخ بڑھانے کے لیے ،اور مارکیٹوں کی تقسیم میں بڑا حصہ لینے کے لیے،آپس میں جنگیں کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔یہ اس کی پیشہ ورانہ ضرورت ہے۔گوکہ جنگیں تو فیوڈل سماج میں بھی ہوتی تھیں مگر چونکہ وہ بہت قریب کی زمینوں پہ قبضے کے لیے ہوتی تھیں اس لیے اتنی خطرناک نہیں ہوتی تھیں۔کیپٹلزم تو عالمی جنگیں چھیڑتا ہے،ایف 16،اور ڈرون سے ہلاکت خیز بمباریاں کرتا ہے،حتی کہ ایٹم بم مارتا ہے ۔یوں وہ دنیا کو اپنی مطابقت میں ڈھالتا جاتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ آج ساری دنیا کیپٹلزم کی مہیب ترین مشین یعنی ،آئی ایم ایف ، ورلڈ بینک اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی ہلاکت خیز پالیسیوں سے بندھی ہوئی ہے۔جنہیں بہ وقتِ ضرورت ڈیزی کٹر بموں سے لاگو رکھا جاتا ہے۔اور ہیروشیما اور ناگاساکی بنائے جاتے ہیں۔

اشتہار

دنیا بھر میں اپنی پراڈکٹ بیچنے کے لیے کیپٹلزم کے بے شمار ہتھکنڈوں میں سے ایک کمال ہتھیار ''اشتہار'' ہے۔یہ اشتہار پچھلے زمانوں میں اخباروں رسالوں میں چھپتے تھے۔پھر جب ریڈیو آیا تو اُسے استعمال کیا گیا،اب تو ٹی وی اور کمپیوٹر کے بے شمار ماہر اور کثیر الجہت ہاتھ (انٹرنیٹ،فیس بک،ٹوئٹر وغیرہ وغیرہ) اس اشتہار بازی کے لیے وقف ہو چکے ہیں۔

اشتہار کا کیا مطلب ہے؟۔اشتہار کا مطلب ہے:''نقلی ضرورت پیدا کرنا'' اور اشیا کی خریداری کی خواہش پیدا کرنا ہے۔آپ کے اندر بغیر بھوک کے کسی چیز کی بھوک پیدا کرنا۔بغیر ضرورت کے ضرورت پیدا کرنا۔یہ ایک غیر انسانی اور غیر فطری بھوک ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ بھوک پیدا نہیں ہوتی، پیدا کی جاتی ہے۔ٹائیڈی سی، پلاسٹکی سی ،سوفسٹی کیٹڈ سی بھوک۔ آپ مارکیٹ کے ''دانگ زدہ'' بگ کے اونٹ بن جاتے ہیں۔یعنی،نشانہ بنا کر آپ کو غیر ضروری اشیا کا ضرورت مند بنایا جاتا ہے۔آپ کا پیسہ بغیر کسی ضرورت کے آپ کی جیب سے پھسلتا جاتا ہے اور مارکیٹ کے مالک کے بینک میں گرتا جاتا ہے۔آپ اس کے اتنے عادی بن جاتے ہیں کہ بعد میں زیاں کا احساس ہی نہیں رہتا۔اور آپ خود کو اکیلے میں بھی نہیں کوستے۔

پانی موجود مگر آپ کو منرل واٹر پر لگایا جاتا ہے،آپ تمبا کو نوشی نہیں کرتے مگر اشتہار آپ کو سگریٹوں پر لگا دیتے ہیں۔شمپو، سے لے کر کار موٹر تک اشتہار آگے آگے،انسان پیچھے پیچھے ، جب تک کہ جیب کا آخری آنہ ٹکہ تک نکلا نہ ہو۔اور اب تو ٹکہ کو بھی نہیں دیکھا جاتا۔آدمی مارو اشیا خریدو،گردے بیچو،اشیا خریدو۔لاش،وطن بیچو،اشیا خریدو۔۔

''زمانہ جیٹ کی رفتار سے ترقی کر رہا ہے۔ہر لمحہ چیزوں کی شکلیں بدل رہی ہیں۔

گذشتہ سال کی مرسیڈیز نئے ماڈل کے سامنے جیسے چھکڑا، پرانی استری نئی کے سامنے بالکل کھٹارا۔۔۔آج خریدو، کل پرانی۔آپ اشتہار کے زور پہ نیا موبائل فون خریدیں گے مگر اشتہار ہی تین ماہ کے اندر اندر آپ کے اس موبائل کو بے کار اور آؤٹ ڈیٹڈ ثابت کر دے گا، اور آپ سے اس کا جدید ماڈل خریدوائے گا۔نیا نیا، جدید جدید، لذیذ لذیذ۔ بس خریدتے جاؤ، کُڑھتے جاؤ، ترستے جاؤ۔ پھر خریدو، پھر پچھتاؤ۔سب کچھ پا کر بھی وہی محرومی، نامرادی اور احساسِ کمتری''۔(عصمت چغتائی۔خریدلو)

اشتہار کافر نہیں کفار چیز ہے۔ یہ بہت ناز سے، تسلسل کے ساتھ، آپ سے چیزیں خریدواتا رہتا ہے۔ہم عصمت چغتائی کو نقل کریں گے جس نے ''خریدلو'' میں ہمیں سب کچھ ایسے انداز میں سمجھایا کہ میرا قلم واپس جیب میں۔''جب کبھی نیا فیشن آتا ہے، تو فوجی ناکہ بندی سی شروع ہو جاتی ہے۔چپکے چپکے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں تیار کر کے ہر سٹور کی ہر شاخ میں مال پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہر شوکیس سجا دیا جاتا ہے اور پھر حملہ شروع ہوتا ہے۔خریدلو۔ جلدی۔فوراً نہیں تو مٹ جاؤ گے، تباہ ہو جاؤ گے۔ساری عمر سر دھنو گے۔وقت جا رہا ہے۔ سٹاک ختم ہو جائے گا، ابھی، اسی دم نہ خریدا تو قیامت آ جائے گی، عاشق منہ پھیر لیں گے، شوہر طلاق دے دیں گے، باس نوکری سے نکال دیں گے، ساری عمر کنواری یا طلاقن بن کر سسکو گی۔نقد خرید۔۔۔چلو قسط پر، ادھار ہی خرید لو، ورنہ یہ معمہ حل کرو تو مفت ہی لے جاؤ۔ ۔۔نقد خریدو، تو ساتھ میں بسکٹ کا ڈبہ مفت۔۔۔مفت۔۔۔ ایک دم خریدو تو صابن کی ٹکیاں بالکل مفت۔

''روٹھے ساجن کو منانا چاہو تو فلاں جھاڑو فوراً خریدو، باس کو غلام بنانا چاہو تو اسی دم نیا چولھا خریدو۔میاں طلاق دے رہا ہے۔دوسری عورت پر ریجھ رہا ہے، کیونکہ وہ ہمارا بغل گندلوشن اور منہ کی سڑاند دور کرنے والا پیسٹ استعمال کرتی ہے۔گھر نہ بگاڑو، تم بھی خرید لو۔۔۔''۔

''اچھی نوکری چاہیے تو جسم کو نکیلا اور ننگا دکھانے والی برا خریدو!۔

''اس کمبل میں خواب زیادہ سہانے ہوں گے''۔

''یہ میدہ کیک بنانے میں استعمال کرو، وہ تمہیں گود میں اٹھا لے گا'' (تصویر۔ ۔۔ایک ہیرو کی گود میں ٹانگیں چلاتی حسینہ)۔

''پڑوسن کا میاں بہت بوسے لیتا ہے، کیونکہ وہ ہماری نئی استری استعمال کرتی ہے، تم کیوں ترسو؟''۔

کارپوریٹ سیکٹر کے اشتہارات بہت ہی مقبول باتوں کو پیشِ نظر بنا کر تیار کی جاتی ہیں۔اور یہ کام الگ سے اشتہاری کمپنیاں کرتی ہیں۔

اتنا پیسہ کرنا کیا ہے؟

منافع ایسی پیاس ہے کہ کسی طور بجھتی ہی نہیں۔ اِس پیاسے ایک فیصد آبادی کے ہونٹ مکران کی ریت کی طرح سوکھے ہی رہتے ہیں۔ پیٹ پانی (منافع) سے پھولا ہوا مگر لب خشک۔یہ لب کبھی تر ہوتے ہی نہیں۔اس پیاس کو بلوچی میں ''آف ڈھاگ'' کہتے ہیں۔ کیپٹلسٹ کو سرپلس ویلیو کے ''آف ڈھاگ'' کی پیدائشی بیماری لگی ہوتی ہے۔

یہ پیاس کیوں؟ یہ حرص کیوں؟۔ وہ اس قدر زیادہ سرپلس ویلیو سے حاصل کیے ہوئے سرمایہ کو استعمال کہاں کرتا ہے؟۔اس بے پناہ سرمایہ کا انت آخر کیا ہے؟۔

یہ سرمایہ چار مدّوں میں مکمل طور پر خرچ ہو جاتا ہے۔اتنا کہ اُس کے پاس کچھ نہیں بچتا۔لہذا وہ پھر پیاسا ہو جاتا ہے۔اور پھر پاگل پن میں مزید سرمایہ نچوڑنے میں لگ جاتا ہے:

1۔انہیں امیر ترین شخص کہلائے جانے کا شوق ہوتا ہے۔''سب سے بڑا خیرات کرنے والا''

بننے کا شوق۔ پیسہ گننے کا شوق، گنتے رہنے کا جنون۔ بینک بیلنس۔

بلوچی کی ایک فوک کہانی کہتی ہے کہ ایک بھکاری سارا دن بھیک مانگتا تھا۔ شام کو اپنی جھونپڑی میں پہنچ کر کھڈا کھودتا۔ وہاں پڑے ہوئے پچھلے سارے سکے اور نوٹ گنتا، پھر آج کی ریزگاری گن کر اُس میں شامل کرتا، دوبارہ کھڈے میں دفن کرتا اور سکون سے سو جاتا ۔بستی کے کسی شرارتی بچے کو اس کی اس عادت کی خبر ہوگئی۔ اس نے دو چار دوستوں سے مل کر ایک شام اس کی آمد سے ذرا پہلے کھڈے سے پیسے نکال کر جھونپڑی میں دوسرے کونے میں رکھ دیے۔ شام کو جب پیسہ گننے کا شوقین بھکاری آیا تو سیدھا کھڈے کی طرف گیا۔ کھودا، اسے خالی دیکھا تو وہیں مر گیا۔

2۔ وہ اس انبار سرمائے کا ایک حصہ اپنی ضروریات (عیاشی) پہ صرف کرتا ہے۔ عیاشی جو کبھی ختم نہیں ہوتی، کبھی کم نہیں ہوتی ۔۔ لامحدود اور لامختتم۔ وہ اپنی طرح پورے معاشرے کو خرچ واصراف سے مسرت کے حصول کے نامعقول کنفیوژن میں ڈال دیتا ہے۔ ایک طرح کی حرص ، ہوسنا کی اور بھیڑیا گیری ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

3۔ عجیب عجیب خواہشات کی تکمیل۔ گورکی نے بہت بڑے پیسے والے آدمی کا انٹرویو لیا کہ اس کی کونسی خواہش ہے جو ابھی پوری نہیں ہوئی۔ اُس امیر آدمی نے اپنے وسیع لان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنے پیسے سے دنیا کے طاقتور ترین دو ملکوں کے سربراہوں کو کرایہ پہ لے کر اپنی اس لان میں اُن کی کُشتی کروانا چاہتا ہوں۔

4۔ مزید سرمایہ ہتھیانے کے لیے وہ بقیہ سرمایہ پھر پیداواری عمل میں ڈال دیتا ہے۔

کیپٹلزم کی تباہیاں، تباہ کاریاں

ہر دم جوانی کی دوائیاں پی پی کر تازہ دم اس مردِ معمر میں، مگر پانچ پیدائشی بیماریاں

موجود ہیں: معاشی بحران، ماحولیاتی بحران، نیوکلیر تباہی، بیگانگی، اور اخلاقی بحران۔

1۔ معاشی بحران

سرپلس ویلیو کے عالمی نظام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں اوسطاً ہر چھ آٹھ برس بعد معاشی بحران پیدا ہوتا رہتا ہے۔ منافع کی لالچ میں پیداوار بڑھاتے بڑھاتے اُس کے ہاں تیار مال کی مقدار بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس قدر زیادہ کہ اس ''سارے'' کی فروخت اور کھپت ناممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ عوام کی قوتِ خرید کو پیشِ نظر رکھ کر قیمتیں کم کر کے دیکھتا ہے، مگر خریداری میں کوئی بہتری نہیں ہوتی۔ سوائے اس بات کے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا کہ اُس کے مقابلے والے سرمایہ داروں کا بھٹہ بیٹھ جاتا ہے۔

''اوور پروڈکشن'' کی وجہ سے ''اوور پروڈکشن بحران'' پیدا ہوتا ہے۔ گودام بھرے ہی رہتے ہیں، سڑ جاتے ہیں۔ معاملہ اس قدر گھمبیر ہو جاتا ہے کہ اِس مال کو ٹھکانے لگانا ضروری ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دار اب دو کام کرتا ہے:

1۔ سارے گوداموں کو خالی کرتا ہے۔ فروخت نہ ہو سکنے والے پراڈکٹس کو آگ لگاتا ہے، انہیں مٹی میں ملا کر استعمال کے قابل نہیں چھوڑتا، اور اگر اناج ہے تو اُسے سمندر میں پھینکوا کر گوداموں کا بوجھ خالی کیا جاتا ہے۔ عالمی اخبارات میں آئے دن ایسی خبریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ محترم غنی پرواز نے ایسے کچھ واقعات ہمارے لیے جمع کیے:

''1229-33 کے عالمی بحران کے دوران امریکہ میں کوئلے کے بجائے گیہوں اور مکئی کو ایندھن کے طور پر استعمال کیا گیا، کپاس کا بیشتر حصہ کھیتوں میں ہی خراب ہونے دیا گیا۔ لاکھوں سوئر مار دیئے گئے۔ برازیل میں قہوے کی لاکھوں بوریاں سمندر میں پھینک دی گئیں۔ ڈنمارک میں سینکڑوں گائیں مار ڈالی گئیں۔ فرانس اور اٹلی میں ہزاروں ٹن پھل ضائع کر دیئے گئے۔ حالانکہ اُسی دوران عام غریب لوگ اپنی اہم ترین ضروریات سے بھی محروم

رہے۔‘‘(1)

2۔ بورژوازی (کیپٹلسٹ) اپنے کارخانے اور فیکٹریاں مکمل طور پر بند کر کے مزدوروں کو جاب سے نکال باہر کرتا ہے۔

یہ معاشی بحران اب اپنے پر پھیلا کر سیاسی ثقافتی بحران بن جاتا ہے۔

معاشی بحران سرمایہ داری نظام میں اس لیے ناگزیر ہے کہ اس میں پیداواری عمل تو اجتماعی ہے، مگر پیداوار کی ملکیت نجی ہے۔ یہ ایک بنیادی تضاد ہے۔ اور اسی کے اندر سرمایہ داری نظام میں معاشی بحران جنم لیتا رہتا ہے۔

سرمایہ داری نظام کا بنیادی تضاد مزدوروں اور مل مالکوں کی کش مکش کی صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ داری کی ترقی کے ساتھ ساتھ ذرائع پیداوار چند ہاتھوں میں سمٹ جاتے ہیں اور عوام کی بڑی اکثریت محنت کشوں کی صفوں میں شامل ہو جاتی ہے جو معاشی بحران کے دوران بے روزگاروں کی صفوں میں اضافہ کرنے کا سبب بنتی ہے۔

دونوں صورتوں میں ایک عالمی انسانی المیہ وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ 1929 میں سٹاک مارکیٹ کریش سے لے کر 2007 کے بحران تک اور پھر 2022 کے معاشی recession (کساد بازاری) تک ایک پورا دائرہ ہے جو ہر چھ آٹھ سال بعد چلتا آ رہا ہے۔ اس لیے ماہرین نے اس کا نام ’’Cyclic Crisis of capatalism‘‘ رکھا ہے۔

کیپٹلزم کے اندر اس عالمی انسانی بدبختی کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ معاشی بحران سے نجات سرمایہ داری کے خاتمے پر ہی منحصر ہے۔

2: ماحولیاتی بحران

زندگی کو ہلکا نہ لینے والے جانتے ہیں کہ دنیا میں ماحولیاتی بحران اب ایٹمی جنگ جتنا

بڑا خطرہ بن چکا ہے۔ ہماری پوری تاریخ میں انسان اور نیچر کے بیچ ہمیشہ سے ایک توازن موجود رہا ہے۔ مگر اندھا دھند انڈسٹریلائزیشن کے سبب اس توازن میں ایک بنیادی جھول پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ عدم توازن پیدا کیا منافع نے، منافع کی لالچ نے، کیپٹلزم نے۔ ’’منافع‘‘ بہت ناترس، پیاسا، اور لامحدود جذبہ ہوتا ہے۔ یہ بنی نوع انسان کے خلاف بھیڑیوں اور لگڑ بھگڑوں کی ایسی دوڑ ہے جس میں ’’جیتنا‘‘ نہیں، بلکہ ’’جیتتے رہنا‘‘ ہی مقصد ہوتا ہے۔ ’’جیتتے ہی رہنے‘‘ میں اُن کی بقا ہے، وگرنہ بھیانک موت۔ اس دوڑ کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدمقابل خواہ جاندار ہوں یا کاربن سے بنی ’’اشیا‘‘ بس اُسی کی تجوریاں بھرتے رہنے کا کام کرتی ہیں۔ کیپٹلزم نے منافع کی خاطر اپنے اندر موجود موروثی تباہ کن سرمایہ دارانہ پیداواری پراسیس کو تیزی سے، اور اندھا دھند انداز میں بڑھایا۔ بالخصوص اُس نے فاسل فیول انڈسٹری (پٹرول، سوئی گیس، کوئلہ) میں سرمایہ کاری کرنے میں لامحدود دوڑیں لگائیں۔ نتیجہ یہ کہ ماحولی آلودگی خطرناک سطح تک بلند ہو چکی ہے۔ منافع کی نہ بجھنے والی پیاس نے، ایک طرف تو زمین کے محدود وسائل کو کم کر دیا، اور دوسری طرف، ماحولیاتی تباہی کو برداشت کرنے کی زمین کی سکت سے کئی گنا بڑا بوجھ اُس پہ ڈال دیا۔

ہم انسان نیچر (فطرت) سے الگ نہیں، بلکہ اِس کا حصہ ہیں۔ اور ہم نیچر کے ساتھ لیبر پراسیس کے ذریعے انٹر ایکٹ کرتے ہیں۔ مگر لالچی کیپٹلزم نیچر اور انسانی معاشرہ کے درمیان موجود باہمی انحصار میں ایک بڑی دراڑ پیدا کرتا ہے، ایک دشمنی پیدا کرتا ہے۔ یوں یہ انسانوں کے اندر اپنے لیبر سے اور نیچر سے بیگانگی پیدا کرتا ہے۔ سلسلہ نہ رکا تو ماحولیاتی بحران تباہ کن ہوتا جائے گا اور اس کے مہلک اثرات نسلوں تک انسانیت کو کھرچتے رہیں گے۔

کیپٹلسٹ پیداوار کی انارکی، استحصال، اور عدم مساوات ماحولیات کے اس بحران کو تیز کرتے جاتے ہیں۔ حتی کہ وہ اِس بحران سے نمٹنے کی ہر کوشش کی جڑیں کاٹتا ہے۔

یہ بحران کیا ہے؟۔ یہ بحران ہے سطح سمندر کی بلندی کا، گلوبل وارمنگ کا، بہ یک

وقت قحط اور سیلاب کا، صحراؤں کے رقبے میں مسلسل وسعت کا، موسموں کی انتہا پسندی کا، سمندر کی تیزابیت کا، اور وسیع پیمانے پر درختوں، پودوں اور جانداروں کی انواع یعنی Species کی معدومیت کا۔

ماحولیاتی بحران اپنی تباہی کے ساتھ اکیلا نہیں آتا۔ اس سے بڑے پیمانے پر مالیاتی بحران پیدا ہوتے ہیں، وسیع معاشی مائیگریشنیں ہوتی ہیں، غربت، بھوک، بیماریاں عام ہوجاتی ہیں اور ٹکنالوجیکل انقلاب کے ذریعے مزدوروں کی بڑھتی ہوئی معاشی مہاجرت مہیب ہوتی جاتی ہے۔

منافع انسانیت کی التجاؤں صداؤں ماتموں کے سامنے بہرا اور اندھا ہوتا ہے۔ اُسے پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ اس کی اندھا دھند، اور بے اصول و بے قانون وسعت کی بیماری اُس کی اپنی ہست ہی کو خطرات سے دوچار کرتی جاتی ہے۔ دھڑا دھڑ صنعتیں لگاتے جاؤ، بے روک ٹوک کنزیومر اور صارف پیدا کرتے جاؤ۔ وہ اس بات پہ کان ہی نہیں دھرتا کہ اس کے بہرے حرص اور اندھی لالچ سے دنیا گلوبل وارمنگ، اور گرین ہاؤس اثرات کے بیچ لاکھڑی کردی گئی ہے۔ سب کچھ بھسم ہونے کو ہے۔ مگر کیپٹلزم کے اس خودکش رجحان کا اُس کے اپنے پاس بھی کوئی علاج موجود نہیں ہے۔ یہ تیزی سے انسانیت کو ختم کرتا جارہا ہے۔

ماحولیاتی تباہی سے بچنے کا حتمی طریقہ یہ ہے کہ انسانیت کو ''منافع'' نامی لاعلاج مرض سے نجات دلائی جائے۔ سماج کا ریڈیکل تنظیمِ نو ہی حل ہے۔ اور تنظیمِ نو کا مطلب پوری انسانیت کے قدرتی وسائل کا مشترکہ استعمال ہے، دولت کی ازسرِ نو تقسیم ہے۔ ورکنگ کلاس اور عوام الناس کی منظّم قوت کے ذریعے مداخلت ہے۔ بین الاقوامی ورکنگ کلاس کا اتحاد ہے۔

3: ایٹمی جنگ کا خطرہ

زندگی دنیا میں حسن، خوشبو، مناظر، لطف، مسرت اور نعمت کے اجتماع کا نام ہے۔ اس دلبر زندگی کو 1940 سے ایٹمی جنگ کا ایک بڑا خطرہ درپیش ہے۔ پورے کرہِ ارض کو یہ خطرہ درپیش ہے، امریکہ سے۔ پیسہ ضائع کرنے والے جنگی اخراجات اُس ملک کے بجٹ کا نصف بناتے ہیں۔

دوسری عالمی سامراجی جنگ میں ایٹم بم کے ذریعے نظام بچانے کی کوشش کی گئی۔ مگر وہاں سوشلسٹ ملکوں کی ایک رجمنٹ پیدا ہوگئی۔ اور دوسری طرف غلام ممالک کی طرف سے آزادی کی فیصلہ کن جنگوں نے سامراجی نظام کے گھٹنے ٹیکوادیے۔

اور پھر سوویت یونین 1991 میں فوت ہوگیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کی فوتگی کے بعد امریکہ ایک نارمل ملک بن جائے گا۔ سوویت مرگ کے بعد جنگ پہ خرچہ کرتے رہنے کا امریکہ کا سب سے بڑا جواز ختم ہوگیا ہوگا۔ مگر نہیں، ایٹمی اسلحہ سازی کی بھٹیاں فیکٹریاں تو اُسی طرح گرم اور سرگرم ہیں۔ دنیا بھر میں اس وقت امریکہ کے 800 فوجی اڈے ہیں۔ یہ جو خیال تھا کہ کولڈ وار کے خاتمے کے بعد ایٹمی تباہی کا خطرہ کم ہوگا، غلط ثابت ہوئے۔ آج یہ خطرہ کولڈ وار کے زمانے سے کئی گنا زیادہ بڑھ چکا ہے۔

اس خطرے کا کم کرنا انسانیت کا دوسرا بڑا چیلنج ہے۔ بالخصوص امریکی ''سماج'' کو غیر فوجی بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ سمجھ لینا ہوگا کہ ملٹری مصنوعات پر خرچ کیا جانے والا ہر ڈالر انسانیت کی روحانی، اخلاقی اور طبعی موت میں حصہ دار ہے۔ یہی ایک ڈالر تو ہمیں ماحولیاتی بحران سے نمٹنے کی طرف خرچ کرنا تھا، انفراسٹرکچر کو بہتر بنانے پر صرف کرنا تھا، ہیلتھ، ایجوکیشن اور ہاؤسنگ پر لگانا تھا۔

4: بیگانگی

ایلی اے نیشن

Alienation

ہم نے اکثر ٹی وی یا سوشل میڈیا میں معدنی کان مزدور کے ہاتھوں میں چھالے پڑی ترس ابھارتی تصویریں دیکھی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مزدور پہ ترس اور ہمدردی پیدا کرنے والی تصویریں، کمنٹس، کیپشن اور شاعری ہم جابجا دیکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا محنت ایک بوجھ ہے، ایک بے چارگی والی بات ہے؟۔ کیا محنت کرنا محض مجبوری ہے، جبر ہے، compulsion ہے؟۔ اسی طرح کیا محنت کش پہ ترس کھایا جانا چاہیے؟۔

بات اس کے بالکل الٹ ہے۔ محنت ہرگز بوجھ نہیں، مزدور نہ تو قابلِ رحم ہے، اور نہ قابلِ ترس۔

اس لیے کہ محنت تو انسانی باشعور سرگرمی کا اہم ترین جزو ہے جو ہمیں جانوروں کی دنیا سے بلند کرتی ہے۔ انسان مکمل ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ محنت کرتا ہے۔ محنت ہماری species پہ نیچر کی طرف سے لاگو کردہ ایک لازمی شرط ہے۔ نہ صرف لازمی، بلکہ دائمی بھی۔ محنت وہ محترم، معزز اور ممتاز عمل ہے جو صرف اور صرف اشرف المخلوقات یعنی انسان سے مخصوص ہے۔

قابلِ ترس تو محنت نہ کرنے والا ہٹا کٹا کیپٹلسٹ ہوتا ہے۔ وہ شخص قابل رحم ہوتا ہے جو محنت نہیں کرتا، جو دوسروں کی محنت پہ کھاتا پیتا اور عیاشیاں کرتا ہے۔ دوسروں کی محنت پہ پلنے والا ہی طعنہ اور نفرت کے قابل ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ کام نہیں کرتے اور ''امیر'' کہلواتے ہیں، وہ بطور انسان انتہائی بے امید، ویران، اور خودغرض لوگ ہوتے ہیں۔ جو شخص جتنا زیادہ امیر ہوگا اتنا ہی اندر سے سڑا ہوا ہوگا۔ اب تو دنیا میں چند فیصد لوگ بہت، بہت، بہت امیر ہیں۔ ان امیروں کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں، ماسوائے لوٹ کے۔ انہیں عام انسانی شادی غم، رسم وقانون، اور کھیل وآرٹ سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ کوری، بے کیف اور سڑاند بھری حیات۔

اور یہ بے کیف انسان، اپنی کوری زندگی اپنے مزدور کو منتقل کرنے کا جرم کرتا ہے۔ محنت جو انسان کی آن شان اور افتخار وامتیاز ہے اُس وقت رذیل وذلیل بن جاتی ہے جب اس پہ کیپٹلسٹ کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

مشینوں کے آنے سے قبل انسان دستکاری کرتا تھا۔ درکھان، لوہار، جولاہا وغیرہ کے بطور۔ وہاں اُس کے اوزار اُس کی مرضی کے تابع تھا۔ دستکاری میں کام کرنے والا دستکار اپنے اوزار کو استعمال کے مطابق بناتا ہے، جبکہ فیکٹری میں مشین آدمی کو استعمال کے مطابق بناتی ہے۔ دستکاری میں اوزار کی حرکات مزدور سے روانہ ہوتے تھے مگر کیپٹلزم میں مزدور کو مشین کی حرکت کی پیروی میں بھاگنا ناچنا ہوتا ہے۔ دستکاری میں کام کرنے والے جاندار میکنیزم کے حصے ہیں، جبکہ فیکٹری میں کام کرنے والا فیکٹری کا محض زندہ ذیلی ضمیمہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے کام میں دل کشی کی ہر باقیات کو تباہ کرتا ہے اور اسے ایک نفرت انگیز جان توڑ

مشقت بناتا ہے۔

دستکار کے کام کی جگہ ایک عوامی بیٹھک ہوتی تھی۔ دستکار کام کر رہا ہوتا اور ساتھ میں گپ شپ بھی ہوتی۔ لوگوں کا آنا جانا رہتا۔ حال حوال ہوتا، تبصرے ہوتے، ہنسی مذاق ہوتا، حکایتیں لطیفے، سفرنامے، موسیقی پہ باتیں ہوتیں، گیت اور گانے ہوتے۔ مال مویشی، فصل اناج، قیمتیں، اور رسم ورواج پہ گفتگو ہوتی۔ یوں یگانگت اور زندگی کی ہلچل رہتی۔

مگر جب سماج ترقی کر گیا۔ دستکار کے اوزار کی جگہ مشین آ گئی تو وہ مشین اب مزدور کی مرضی پہ نہیں چلتی۔ اب تو مزدور (انسان) کو مشین کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔ وہ مشینوں کا پُرزہ بن گیا۔ اُس کو اب نہ اپنی محنت کے دورانیے پہ اختیار رہا، نہ اپنی محنت کی نوعیت وہ خود مقرر کر سکتا ہے، اور نہ ہی اب اسے اپنی محنت کی پیداوار سے کوئی سروکار ہے۔ ہر شے اُس کے لیے غیر بلکہ اُس کی ذات کی حریف بن جاتی ہے۔

اسی حالت کو alienation کہتے ہیں۔ یہ ایک اٹالین لفظ ہے جس کا مطلب ہے کسی اور علاقے کا آدمی ''غیر'' بیگانہ۔

فلاسفر مارکس نے بیگانگی کی چار شکلیں متعین کی ہیں:

1۔ محنت کش کی اپنی محنت سے بیگانگی

محنت کش کے پاس اپنی بنیادی ضرورتوں کو پُورا کرنے کا بس ایک ہی ذریعہ ہے: اپنی قوتِ محنت کو کسی غیر کے ہاتھ فروخت کرنا۔ ایسی صورت میں محنت، اُس محنت کش کی ذات سے خارج شے بن جاتی ہے۔ پیداوار کے عمل میں مزدور کی اپنی سرگرمی کے ساتھ رشتہ ایک اجنبی کی طرح ہو جاتا ہے، ایسا جو اُس کا نہیں ہے۔ بلکہ اب اس کی یہ محنت اُس کے دشمن طبقے کی ہے، یعنی اس کی اپنی محنت اُس کے مدِ مقابل آ کر اس کے دشمن کی خدمتگار بن جاتی ہے۔

چنانچہ اب اس کی یہ سرگرمی ایک تکلیف بن جاتی ہے۔ اس کی طاقت اس کی بے طاقتی میں بدل رہی ہے، اس کی تخلیق اسے لاغری اور کمزوری کی طرف دھکیلتی جاتی ہے۔ یعنی اس کی محنت اس کے بنیادی وجود کی ملکیت نہیں ہوتی، بلکہ سرمایہ دار کی ملکیت ہوتی ہے۔ لہذا وہ کام کے دوران اپنی ذات کا اقرار نہیں کرتا بلکہ اس کی نفی کرتا ہے۔ وہ اپنی جسمانی اور ذہنی توانائی کو آزادانہ فروغ نہیں دیتا بلکہ اپنے جسم کی تحقیر اور دماغ کا زیاں کرتا جاتا ہے۔ اُس کی محنت اپنی مرضی سے نہیں ہوتی بلکہ جبری ہوتی ہے۔ اس محنت سے اس کی کسی ضرورت کی تسکین نہیں ہوتی بلکہ وہ فقط ذریعہ ہوتی ہے، دوسرے (سرمایہ دار) کی عیاشیوں کی تسکین کا۔

2۔ اپنی پیدا کردہ چیزوں سے بیگانگی

جس رفتار سے پیداوار کی مقدار، اور حلقہ اثر میں اضافہ ہوتا ہے اُسی رفتار سے محنت کار کا افلاس بڑھتا ہے۔ وہ جتنی زیادہ چیزیں پیدا کرتا ہے اتنا ہی وہ خود بہ حیثیت بازاری جنس کے سستا ہوتا جاتا ہے۔ انسان کی ناقدری براہِ راست اُسی نسبت سے بڑھتی ہے جس نسبت سے اشیاء کی قدر میں اضافہ ہوتا ہے۔ زندگی سستی، اور چیزیں مہنگی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محنت کی پیداوار محنت کار کی دشمن بن کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ وہ اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کا غلام ہو جاتا ہے۔

صرف یہ نہیں ہے کہ چیزوں کی دنیا انسان کی حکمران بنتی ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ انسان جو سماجی اور سیاسی حالات پیدا کرتا ہے، وہی اس کے مالک بن جاتے ہیں۔ اُن چیزوں کی مضبوطی، جو ہم خود پیدا کرتے ہیں، جو ہمارے اوپر ایک قوت بن جاتی ہے، ہمارے کنٹرول سے بڑھ جاتی ہے، ہماری توقعات کو ادھورا کرتی ہے، ہمارے کیلکولیشنز کو صفر پر لاتی ہے۔۔۔ یہ اب تک کی تاریخی ترقی میں اہم ترین عناصر میں سے ایک ہے۔ بیگانہ شدہ آدمی،

جو سمجھتا تھا کہ وہ نیچر کا مالک ہو چکا ہے، مگر وہ چیزوں اور حالات کا غلام بن گیا، ایک ایسی دنیا کا دُم چھلا بن گیا جو کہ بہ یک وقت اُس کی اپنی قوتوں کا منجمد اظہار ہے ۔

محنت کار جتنی محنت صرف کرتا ہے، اور اس کی تخلیق کردہ معروضی دنیا جتنی طاقت ور ہوتی جاتی ہے، اس کی ذات، اس کی باطنی دنیا اتنی ہی مفلس اور قلاش ہوتی جاتی ہے۔ محنت کار پیداوار میں اپنی جان کھپا دیتا ہے لیکن یہ جان اس کی ملکیت نہیں رہ جاتی بلکہ پیداوار کی ملکیت بن جاتی ہے۔ پیداوار جتنی بڑھتی جاتی ہے، محنت کار کی معروضی محرومی بھی اتنی ہی بڑھتی ہے۔

محنت کار کو نہ تو پیداوار کی نوعیت متعین کرنے کا حق ہوتا ہے، اور نہ کام کے حالات، کام کرنے کی جگہ، اور نہ پیداوار کی تقسیم میں اُس کا کوئی دخل ہوتا ہے۔ اس کو اپنی زندگی پیداوار کے تقاضوں کے سانچے میں ڈھالنی پڑتی ہے۔

اور یہ حکمرانی انسان پہ خود اس کے اپنے ہاتھوں کے بنائے پراڈکٹس کی حکمرانی ہوتی ہے۔ مشینری انسان کی کمزوری بڑھاتی جاتی ہے، کمزور انسان کو ایک مشین میں بدلنے کو۔

جوں جوں پرائیویٹ پراپرٹی اور تقسیمِ محنت بڑھتی ہے، مزدور کی قوت کے اظہار کا اپنا کیریکٹر گم ہوتا جاتا ہے۔ مزدور اور اس کے پراڈکٹس انسان، اس کے ارادے اور اس کی منصوبہ بندی سے الگ وجود اختیار کرتے ہیں۔ محنت سے پیدا کردہ پراڈکٹ، اب ایک بیگانی وجود کے بطور اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے، ایک قوت کے بطور اپنے پیدا کرنے والے سے آزاد۔ پیداواری سرگرمی ایک بیگانہ شدہ سرگرمی بن جاتی ہے۔

وہ پیداوار کا فیصلہ نہیں کرتا بلکہ پیداوار اُس کی زندگی کا فیصلہ کرتی ہے۔ پیداوار حاکم ہوتی ہے اور وہ محکوم۔ پیداوار آقا ہوتی ہے اور وہ اس کا غلام۔ یعنی مُردے زندوں پر راج کرتے ہیں۔

3۔ دوسرے انسانوں سے بیگانگی

اپنی محنت سے بیگانگی، اپنی محنت کی پیداوار سے بے گانگی، اور اپنے آپ سے بیگانگی کا، براہِ راست نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ وہ اُن کی محنت سے بھی، ان کی محنت کی پیداوار سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ انسان جب خود سے، اور اپنی ذات سے بیگانہ ہو جاتا ہے تو وہ لامحالہ طور پر دوسرے انسانوں سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔

انسان اپنے معاشرے، اپنی تہذیب، اپنی ذات، سب کو بیگانہ اور غیر سمجھنے لگتا ہے ۔ اس کو اپنے گرد و پیش کی ہر شے اجنبی اور غیر نظر آتی ہے اور وہ معاشرے کی تمام قدروں اور سرگرمیوں کو بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کی بستی میں بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرتا ہے۔ اس کی دوسری علامت لاچاری اور بے بسی کا شدید احساس ہے۔

مطلب ہر آدمی دوسروں سے بیگانہ ہے، اور یہ کہ اسی طرح دوسروں میں سے ہر ایک، انسانی زندگی سے بیگانہ ہے۔ لوگ تنہا پسند ہو جاتے ہیں، تقسیم ہوتے جاتے ہیں، وہ دوسرے قریب ترین شخص کو بھی ہمدرد کے بجائے مخالف کے بطور دیکھتے ہیں۔ (اس کا یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ بیگانہ شدہ لوگ اپنے مشترکہ مسائل کے اجتماعی حل کی طرف بہت کم دیہان دیتے ہیں)۔

4۔ بشری زندگی سے بیگانگی

کیپٹلزم کے اندر بیگانگی ذات کا چوتھا شکار انسان کی بشری زندگی ہے۔ انسان کا نوعی کردار اس کا بااختیار آزاد اور شعوری عمل ہے اور یہی خصوصیت اس کو دوسرے جانوروں کی نوعی زندگی سے ممتاز کرتی ہے۔

انسان کا نوعی وجود کھڑا ہی اس بات پہ ہے کہ وہ نئی دنیا تعمیر کرتا جائے۔ نیچر کو تخلیقی طور پر استعمال کرے۔ مگر بیگانگی انسان کے اس شعوری حیاتی عمل یعنی نوعی زندگی کا سارا نظام درہم برہم کر دیتی ہے۔ اس کی نوعی زندگی دوسرے جانوروں کی نوعی زندگی کی سطح پر آ جاتی ہے۔ وہ صرف جینے کے لیے پیدا کرتا ہے جو جانوروں کی نوعی خصوصیت ہے۔

کیپٹلزم کے بطن سے ''بازاری معاشرہ'' جنم لیتا ہے۔ دوسرے لوگ کس طرح زندگی گزارتے ہیں، اس سے کسی کو سروکار نہیں۔ بیگانگی میں ڈوبے فرد کے لیے اب یہ جہاں دوسروں کی ہے۔ وہ اس میں بالکل فٹ نہیں ہے۔

بیگانہ شدہ آدمی انسانیت کے اصل جوہر سے بیگانہ ہے، اپنی ''species being'' سے بیگانہ ہے، اپنی نیچرل اور روحانی خصوصیات دونوں سے بیگانہ۔ انسانی essence سے بیگانگی ایک وجودی انانیت پسندی کی طرف لے جاتا ہے۔

وہ لذتِ عمل سے بیگانہ اور عزم و عمل سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اُن سے ہر جذبہ اور ولولہ چھن جاتا ہے۔ ایسے معاشرے کے لوگ ہر بیداد اور ظلم سہنے کے عادی بنتے ہیں۔ وہ ظالم اور جابر قوتوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔۔۔ اور ذلت کو اپنا مقدر سمجھ لیتے ہیں۔

انسان فطرت پہ زندہ رہتا ہے۔۔۔ اگر اُس نے صفحۂ ہستی سے مٹنا نہیں ہے تو اسے نیچر کے ساتھ ہر حالت میں interchange میں رہنا ہوتا ہے۔ انسان کی فزیکل اور سپر چوئل زندگی نیچر کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے نیچر خود اپنے ساتھ جڑی ہوئی ہے، اس لیے کہ انسان نیچر کا حصہ ہے۔ مگر بیگانہ شدہ آدمی (مزدور طبقہ) اب نیچر سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اسے ماحولی آلودگی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اسے ایسڈ رین سے، گرین ہاؤس گیسز سے، زمین کا ٹمپریچر بڑھنے پہ کوئی تشویش نہیں ہوتی۔

بیگانگی کا مارا شخص جانوروں سے بھی گر جاتا ہے۔ وہ بُت پرستی شروع کرتا ہے۔ بُت جو خود انسان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ہیں۔۔۔ بُت، چیزیں ہیں، اور انسان اُن

چیزوں کے سامنے جھکتا ہے اور اُن کی عبادت کرتا ہے۔ وہ اس کی عبادت کرتا ہے جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ اس طرح کرتے ہوئے وہ خود کو ایک چیز میں ڈھال دیتا ہے۔

انسان جتنا زیادہ اپنی قوتوں طاقتوں کو بتوں میں ٹرانسفر کرتا جاتا ہے، وہ خود کو اتنا ہی بے چارہ تر بناتا جاتا ہے۔ اور وہ بتوں پہ بہت زیادہ انحصار کرتا جاتا ہے، تاکہ وہ اسے اس چیز کا ایک چھوٹا حصہ واپس لینے کی اجازت دیں جو کہ ابتدائی طور پر تھا ہی اسی کا۔ یہ بت کیا ہیں؟۔ یہ ہیں: ریاست، چرچ، اسی طرح کوئی ایک مشکل کشا سردار، لیڈر، یا شخصیت (ہیرو پرستی)۔

***

بیگانگی اُن لوگوں کی فریاد ہے جو خود کو قابو سے باہر اندھی معاشی قوتوں کا شکار محسوس کرتے ہیں۔ یہ عام لوگوں کی فرسٹریشن ہے جو فیصلہ کرنے کے پراسیس سے باہر رکھے گئے ہیں۔ مایوسی اور بے بسی کا احساس جو کہ اُن لوگوں میں سرایت کرتا ہے جو جواز کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں خود اپنی منزل متعین کرنے یا شکل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

کیپٹلزم کے اندر موجود بحران کو کووڈ 19 جیسی وبائیں اور بلوچستان میں 2022 جیسے تباہ کن سیلاب و آفات سنگین تر بناتی ہیں۔ یوں بیگانگی بڑھ جاتی ہے، سماجی نابرابری سنگین ہو جاتی ہے، خود غرضی وسیع ہوتی ہے۔ اس بیگانگی نے قدامت پسند الٹرا رائیٹ کے پراجیکٹ کے حق میں انسانوں کو غیر سیاسی بنانے کو بہت تقویت دی، انتہا پسند اور فاشسٹ تصورات کی پرورش کی۔

بیگانگی محض ایک فلاسوفیکل تصور نہیں ہے۔ یہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ہم اپنی انسانی سرگرمی کو ایک بیرونی، اجنبی اور خود سے دشمنانہ ماحول کے کنٹرول میں پاتے ہیں جس سے ہمارے جسم اور دماغ پہ منفی اثرات پڑ رہے ہوتے ہیں۔ یہ بیگانگی ایک ایسے معاشی نظام (کیپٹلزم) کا نتیجہ ہوتی ہے: جہاں نیچر، دوسرے لوگ اور وہ خود اپنے آپ سے اجنبی رہتے ہیں۔

اس موضوع کو سمجھنے کے لیے ایک بڑے فلاسفر کا یہ ایک فقرہ ہی کافی ہوگا۔ نوع انسان کی تاریخ، انسانی کی بڑھتی ہوئی ترقی کی تاریخ ہے، اور بہ یک وقت بڑھتی ہوئی بیگانگی کی تاریخ ہے۔

***

سوال یہ ہے کہ انسان اس بیگانگی ذات اور اشیاء کی غلامی سے چھٹکارا کیسے پائے؟ ۔اُس کی انسانی معنویت اور بشری قدریں بحال کیسے ہوں؟۔

بات صرف ورکنگ کلاس کی آزادی کی نہیں ہے بلکہ سارے انسانوں کی آزادانہ سرگرمی کے ذریعے کُل انسان کی نجات کی بات ہے۔ اور ایک معاشرہ جس میں انسان، نہ کہ چیزوں کی پروڈکشن مقصد ہو۔ جس میں انسان کا ایک مفلوج عجیب الخلقت ہونا ختم ہو جائے، اور وہ مکمل طور پر ایک ترقی یافتہ انسان بن جائے۔

بیگانگی پہ قابو پانے کا ایک ہی راستہ ہے: چیزوں کو ٹرانسفارم کرنا جس طرح کہ لوگ اپنی محنت کو منظّم کرنا چاہییں۔ لوگوں کے خیالات تعلیم، تبلیغ، پروپیگنڈہ، ماہر نفسیات کے سیشنز کے ذریعے تبدیل کرنا بے سود ہے جب تک کہ بہ یک وقت اُن حالات کو بدل نہ دیا جائے جس میں وہ رہ رہے ہیں۔ مزدوروں کو اُن کے ورک پلیس کے اندر سیاسی اقتدار ٹرانسفر کرنا۔

مارکس کے ہاں سوشلزم کا تصور ہی بیگانگی سے نجات ہے۔

5۔ اخلاقی بحران

کیپٹلسٹ سماج پچھلے فیوڈل سماج کی عظمت، بزرگی اور سفید پوشی کی داڑھی نوچ کر مستحکم

ہوا ہے۔ لازم بھی یہی تھا کہ وہ اپنے سے پچھلے فیوڈل سماج کی اخلاقیات، رسوم و رواج اور طرزِ زندگانی کی دستار روند کر اپنا اقتدار مضبوط کرے۔

کیپٹلزم میں سب کچھ کا محور اب شخص، اور فرد ہو گیا۔ ''ہم قبیلوی''، ''ہم وطنی''، ''ہم مذہبی'' سب کچھ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ چرچ کمزور ہوا۔ پوپ، 18 ویں ترمیم والے صدرِ پاکستان سے بھی کمزور ہو گیا۔ اور سٹیٹ چرچ اور سجادہ نشین سے آزاد ہو کر واحد قوت کے بطور ابھر آیا۔ سٹیٹ میں فرد کو قانون کے سامنے برابری، آزادیِ تحریر و تقریر و تنظیم سازی جیسی آزادیاں نصیب ہوئیں۔

عصمت فروشی

جدید کیپٹلزم میں رنڈی بازی اور سیکس ٹریڈ کے صنعت بن جانے سے کھرب ہا ڈالر کی گلوبل مارکیٹ پیدا ہوئی۔ اس میں ملینوں عورتوں کو شامل کیا گیا جو قومی اور گلوبل معیشتوں کا بہت بڑا حصہ بناتی ہے۔

اب Pimps کو معزز برنس لوگوں میں شمار کر کے روٹری کلب میں شامل ہونے دیا گیا۔ چکلے کی رنڈی بازی کو قانونی بنا دیا گیا اور آسٹریلیا، ندرلینڈ، جرمنی اور نیوزی لینڈ جیسے ممالک میں ایک ''مارکیٹ سیکٹر'' قرار دیا گیا، لباس اتار کر ڈانس کرنا (Stripping) اب ''leisure'' یا ''انٹرٹین منٹ انڈسٹری'' کا باقاعدہ حصہ بنا، اور پورنوگرافی جنرل موٹر جیسی کارپوریشنوں کے لیے کافی معزز بنی۔ ایسی کارپوریشنوں نے پورن چینلوں کو اپنے کاروبار کا حصہ بنایا۔ جبکہ اِس دوران رنڈی باز کی صنعت کا ایک حصہ لیگل، معزز اور منافع بخش مارکیٹ سیکٹر بنا،

رنڈی بازی کی بہت بڑی اکثریت منظّم جرائم کے لیے ایک سب سے منافع بخش
سیکٹر رہا۔(1)

ریفرنسز

1۔شیلا جیفری۔انڈسٹریل وجائنا۔2009۔Roultiedge،لندن۔صفحہ 2

***

کلاس: لوگوں کا ایک گروپ ہوتا ہے جو اپنے معاشی مفادات کے سبب سماج کے دوسرے گروپوں سے مختلف ہو۔ کپٹلزم میں دو شرائط پر دو وسیع گروپ موجود ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے مندرجہ ذیل فرق رکھتے ہیں:

1۔ ذرائع پیداوار کی ملکیت کس کی ہے؟

2۔ دوسرے لوگوں کی محنت پہ کنٹرول کس کا ہے؟

طبقے دو طرح کے ہوتے ہیں: بنیادی طبقے اور غیر بنیادی طبقے۔

بنیادی طبقات

ایک طبقاتی سماج، دو بڑے متصادم کیمپوں میں منقسم ہے جو سیدھا سیدھا ایک دوسرے کے مقابل اور برسرِ پیکار ہیں۔ یعنی وہ جو ذرائع پیداوار اور دوسروں کی محنت کا مالک ہو، اور وہ جس کے پاس اپنی محنت بیچنے کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو۔ یہ دونوں بنیادی طبقات کہلاتے ہیں۔ اس لیے کہ سماج کے اندر پیداواری عمل میں یہی دو طبقات لازم و ملزوم ہیں۔ باقی جتنے بھی لوگ ہیں وہ اِن دو بنیادی طبقات میں نہیں آتے۔ اگر اِن دونوں میں سے ایک طبقہ نہ ہو تو نظام 'طبقاتی'' رہے گا ہی نہیں۔

یہ دونوں بنیادی کلاسز یہ ہیں:

1۔ **بورژوازی:** فرانسیسی زبان کا لفظ۔ مڈل ایجز میں چار دیواری والی فصیل کے اندر چھوٹے سے ''مارکیٹ قصبے'' کے رہنے والوں کو بورژوازی کہتے تھے جو آس پاس پھیلے دیہی کاشتکاروں سے معاشی طور پر ایک قدم آگے ہوا کرتے تھے۔

کپٹلزم کے اندر سرمایہ دار یا کپٹلسٹ کلاس کو ''بورژوازی'' بھی کہتے ہیں۔ ذرائع پیداوار کی ملکیت اس کے قبضے میں ہے، اور دوسروں کی محنت بھی وہی خریدتا ہے۔

2۔ **پرولتاریہ:** فرنچ زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے شہریوں کا سب سے نچلا طبقہ۔ کپٹلزم کے اندر دوسرا بنیادی طبقہ یہی مزدور یا ورکنگ کلاس ہے۔ اور یہ ایک ایسی کلاس ہے جس کے پاس ذرائع پیداوار کی ملکیت نہیں ہے۔ یہ دوسروں کی محنت بھی نہیں خرید سکتا۔ یہ تو اپنی محنت بیچ کر اپنی روزی کماتا ہے۔

بورژوازی طبقہ اور پرولتاریہ طبقہ میں اول الذکر ظالم ہوتا ہے اور دوسرا مظلوم طبقہ۔ پہلا حاکم طبقہ ہوتا ہے اور دوسرا محکوم طبقہ۔ پہلا طبقہ لوٹنے والوں کا ہوتا ہے اور دوسرا لُٹ جانے والا۔

ظاہر ہے کہ دونوں کے مفادات ایک جیسے نہیں ہوتے اور اُن میں زبردست تضاد رہتا ہے۔

چونکہ یہ تضاد بورژوازی اور پرولتاریہ پر مشتمل دو کلاسز کے درمیان ہے، اس لیے اِسے ''کلاس تضاد'' کہتے ہیں۔

یہ دونوں طبقات بنیادی طبقات، معاندانہ طبقات یا مخاصمانہ طبقات بھی کہلائے جاتے ہیں۔اس لیے کہ ان کے معاشی مفادات میں بنیادی اختلافات ہیں۔اور اِن بنیادی تضادات کے بیچ کوئی میڑھ مرکہ، کوئی جرگہ عدالت اور کوئی مصالحت و جنگ بندی ممکن نہیں ہوتی۔ یہ جنگ دونوں فریقوں میں سے ایک کی پرولتاری طبقے کی حتمی فتح اور بورژوازی کی مکمل اور حتمی شکست پر ہی حل ہوتی ہے۔

غیر بنیادی طبقات

معاشرے میں انسانوں کے بیچ کلاس تضاد کے علاوہ دیگر امتیازات بھی ہوتے ہیں۔مثلاً قومیت، جنس، عمر، پیشے، تعلیم، وغیرہ۔اور کبھی کبھی استثنائی طور پر ایک یا بہت سے غیر بنیادی تضادات اس قدر نمایاں ہوجاتے ہیں کہ بالکل بنیادی تضاد کا رول ادا کرنے لگتے ہیں ۔مثلاً بلوچ قومی تضاد۔لیکن استثنا کو چھوڑ کر اصولی بات یہ ہے کہ کلاس تضاد سماج کا اہم ترین تضاد ہوتا ہے۔ باقی ساری سماجی تہیں اور پرتیں اوران کے بیچ تضادات غیر بنیادی ہوتے ہیں۔

کپٹلزم میں پچھلے سماج یعنی فیوڈلزم کے باقیات موجود ہوتے ہیں۔مثلاً کسان طبقہ۔ جو فیوڈلزم میں تو بنیادی طبقہ ہوتا تھا مگر اب کپٹلزم میں نہیں۔مگر یہ پرولتاریہ کلاس کا اتحادی ہوتے ہیں۔

یہ غیر بنیادی طبقات، بنیادی دوطبقات میں سے کسی نہ کسی کا ساتھ دیتے ہیں۔مگر ایسا وہ صرف اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے کرتے ہیں۔ بنیادی طبقات یعنی پرولتاریہ اور بورژوازی میں جو بھی طاقتور ہوتا ہے، یہ غیر بنیادی طبقات اسی کا ساتھی بن جاتے ہیں۔

انٹلی جنشیا، انجینئر، وکیل، ڈاکٹر، ٹیچر اور سائنسدان پر مشتمل پرت نہ تو ایک الگ کلاس رہا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔اس لیے کہ یہ سماجی پیداوار کے نظام میں کوئی آزادانہ پوزیشن

نہیں رکھتا۔اس سماجی سیکشن کی سرگرمیوں کو اُسی بنیادی طبقے کے مفادات مقرر کرتے ہیں جس کی یہ خدمت کرتا ہے۔ بینک مالکان، فوج، پولیس اور افسر شاہی پیداواری عمل سے دور رہتے ہیں۔اس لیے وہ بنیادی طبقات نہیں ہوتے۔ وہ مزدوروں پر جونک لوگ ہیں۔

انٹلی جنشیا کپٹلزم کی خدمت کرتا ہے اس لیے وہ مزدور طبقہ اور اس کی جدوجہد سے دور رہتا ہے ۔اس نام نہاد ''مڈل کلاس'' کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے ۔ یہ کلاس نہیں بس ایک Stratum ہے۔ یہ لازمی طور پر بہت جلد منتشر ہوجاتے ہیں۔بعض دائیں مڑ کر انقلاب دشمن صفوں میں جاملیں گے۔البتہ اس پرت میں سے بعض افراد اپنے علم و دانش کو مزدور طبقے کو شعور دینے اور انہیں منظّم کرنے میں لگا لیتے ہیں۔

ان کے لیے خودمختار رہنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔

پرولتاریہ کی بغاوت اور بورژوازی کی مزاحمت

میں نے جان بوجھ کر ''مزاحمت'' کپٹلسٹ کے ساتھ جوڑ دی۔ منافع کی بیماری کو جاری وساری رکھنا بورژوازی کا جواز، اور اُس کی عادت وخصلت بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس میں کسی قسم کی ''مداخلت'' برداشت کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ چنانچہ اُس کا نظام یعنی کپٹلزم سرمایہ کی اس ریل پیل میں کسی رکاوٹ کی مزاحمت کرتا ہے۔ اور یہ کام وہ طریقوں سے لے کر ہلاکت آمیز اقدامات سے کرتا ہے۔

مثلاً بورژوازی مزدوروں کی اپنی اجرتیں بڑھانے کے مطالبات کی راہ روکنے کا راستہ یہ نکالتی ہے کہ وہ بے روزگاروں کی ایک رجمنٹ پیدا کر دیتی ہے۔ تاکہ جب مزدور اپنی اجرت کم ہونے پہ کام سے انکار کر دے تو اُس ایک کی جگہ پُر کرنے کے لیے دوسو مزدور لائن بنائے موجود ہوں۔ روزگار کے لیے منتظر اِس لشکر کو ''ریزروڈ انڈسٹریل آرمی'' کا نام دیا گیا ہے۔

لہذا ایک استاد کے بقول ''کام کی بھیک مانگنے کے لیے پھیلے ہوئے بازوؤں کا جنگل موٹا ہوتا جاتا ہے، جبکہ خود بازو لاغر ہوتے جاتے ہیں''۔

مزدور نہ صرف خود کو ایک دوسرے سے سستا بیچنے کا مقابلہ کرتے ہیں بلکہ ایک آدمی 5، 10، یا 20 مزدوروں کا کام کرنے کا مقابلہ بھی کرتے ہیں۔

اسی طرح کپٹلسٹ مزدوروں کے اندر سے ایک خوشحال طبقہ پیدا کرتے ہیں اور پھر اُن کے ذریعہ ٹریڈ یونینوں میں اپنا اثر اور رسوخ قائم کرتے ہیں۔ ایسے ٹریڈ یونین لیڈر اور پیٹی بورژوا عناصر مزدور تحریک میں انتشار پھیلانے کا باعث بنتے ہیں اور مزدور تحریک میں موقع پرستی لاتے ہیں۔ مزدور تحریک میں موقع پرستی کا مطلب سرمایہ داروں سے مفاہمت کرنا اور مزدوروں کو کپٹلزم کے خلاف جدوجہد سے باز رکھنا ہے۔ یہی عناصر سرمایہ داروں کے اقتدار کو قائم رکھنے کا باعث بنتے ہیں۔

سرپلس ویلیو کا ''ون وے ٹریفک'' اپنے مخالفین کے لیے ہمہ وقت ننگی تلوار بنے جاری رہتا ہے۔ یہ مخالف کو تہس نہس کرتا ہے۔ کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا کہ جتنے قتل منافع نے کیے ہیں، روئے زمین پہ اُتنے قتل زلزلوں، سیلابوں، وباؤں اور قحطوں نے مل کر بھی نہیں کیے۔

اور بہت تلخ موت دیتا ہے سرپلس ویلیو کا نظام۔ یہ انسانیت کا ہر دم الرٹ، ہر لمحہ ہشیار، اور ہر وقت خبردار دشمن ہے۔ اور یہ دیکھنے میں خواہ جتنا رنگین، اور دلپذیر ہو، ہر وقت ظاہر داری کی خوشبوئیں بکھیرتا ہو، اور مہذب وشائستہ بولتا ہو، مگر یہ اپنے تحفظ کے لیے تصور سے بھی بڑھ کر سفاک ہوتا ہے۔

آپ کسی بھی بھیس میں ہوں، آپ اپنے نعروں ناموں جھنڈوں کو خواہ جتنا چاہیں مدھم اور مبہم رکھیں، یہ آپ کو پہچان لے گا۔ اس کی شناخت کی نظر، سماعت اور سونگھنے کی حسیات والے ریڈار آپ کو سرعت کے ساتھ تلاش کر لیتے ہیں، شناخت کرتے ہیں اور ٹھکانے لگاتے ہیں۔

نظریاتی یا فلسفیانہ بات تو چھوڑیے، یہ نام نہاد اخلاقی ضروریات کے سبب سے بھی اپنے نظام میں تبدیلیاں کرنے نہیں دیتا۔ ''وطن پرستی'' کے نام پر اِس نظام کو ایک چھوٹے جغرافیائی خطے تک محدود رکھنے کی بات سوچنا اُس کے خلاف سنگین غداری ہے۔ ''ملکی مفاد'' کے نام پر اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوئی بھی کوشش موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ مالک طبقات وعظ سے، تقریر سے، اللہ کے واسطے دے کر، ایک ہی قوم یا قبیلے سے متعلق ہونے کے حوالے دے کر، یا، یاری دوستی میں اس بات پہ قائل نہیں کیے جاسکتے کہ وہ بھوکے اور مفلس عوام الناس کی خاطر ملکیت اور حکمرانی سے رضا کارانہ طور پر دستبردار ہوجائیں۔ وہ انسانیت اور انسانی بھائی چارے کے طفیل، یا ہم مذہب اور ہم وطن اور ہم قوم ہونے کے محابے سے یہ سب کچھ ترک نہیں کریں گے۔ تاریخ اور قوموں کے تجربے بتاتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔۔ اس لیے کہ سرپلس ویلیو ہی نظریہِ ضرورت ہے، سرپلس ویلیو ہی جَے ہند ہے، نظریہِ پاکستان ہے، یہی حب الوطنی ہے اور یہی مذہب دوستی ہے۔ اس نظام میں black life matter s جیسے پاپولر نعرے بذاتِ خود جارج فلوئڈ کی گردن دبوچ لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ہمہ گیر نظام ہے جس کا اپنا سیاسی، اخلاقی، اور فلاسوفیکل سسٹم ہے۔ یہ کسی اور نظام کو مانتا ہی نہیں۔ سب نظام اِس میں مدغم۔

کیپٹلزم مقامی کے ساتھ ساتھ ایک عالمی نظام ہے؛ معاشی طور پر بھی، سیاسی طور پر بھی اور نظریاتی وفوجی طور پر بھی۔ امریکہ اور مغربی یورپ اس نظام کی قیادت کر رہے ہیں۔ اس سب کچھ کو الٹ دینے کے لیے مزدور طبقہ مقامی طور پر بھی اور عالمی پیمانے پر بھی تحریک چلائے ہوئے ہے۔ ملٹی نیشنلز کے خلاف، اور کیپٹلزم کے خلاف مزدوروں کی یہ عالمی تحریک سوشلزم کی تحریک کہلاتی ہے۔

کیپٹلزم عالمی طور پر دنیا بھر کی انقلابی تحریکوں کے لیے دشمنی کے جذبات میں گندھا ہوتا ہے۔ اور یہ نظام اپنے بے پناہ وسائل، ملٹری قوت، جاسوسی جال اور سازشوں سے لیس

دنیا کی ہر انقلابی تحریک پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

تاریخ میں صرف ایک ہی نظام ایسا آیا تھا جو صحیح معنوں میں اس بین الاقوامی کیپٹلزم کے سامنے کھڑا ہو پایا تھا اور اُسے کئی بار تہس نہس بھی کر ڈالا تھا۔ وہ متبادل نظام سوویت یونین اور دیگر 22 سوشلسٹ ممالک کا سوشلزم کہلاتا ہے۔ سوشلزم 70 برس تک کیپٹلزم کی جڑیں اور بنیادیں تباہ کرتا رہا۔ مگر اِن ساری کوششوں کے باوجود کیپٹلزم ایک بار پھر زندہ بچنے میں کامیاب ہوا۔

سوشلزم والا یہ متبادل نظام بار بار آئے گا۔ کہیں کامیاب، کہیں ناکام۔ اُس متبادل نظام کا خیال ہے کہ کیپٹلزم کو قدرتی موت نہیں آنی بلکہ اسے قتل کی موت مارنا پڑتا ہے۔ یعنی کیپٹلسٹ رشتے خود بخود ختم نہیں ہوتے بلکہ کسی نے انہیں ختم کرنا ہوگا۔

کلاس سٹرگل کی صورتیں

محروم مزدور طبقے کے پاس خود کچھ کرنے کے بغیر کوئی راستہ نہیں رہتا۔ اُسے خود ہی اپنی نجات کے لیے سٹرگل کرنی ہوتی ہے۔ اُس کے لیے تین طریقے کے سٹرگل موجود ہیں :

1۔ معاشی سٹرگل

یہ مزدوروں اور اُن کی یونین کی روزمرہ کی جدوجہد ہے تاکہ مزدور کی اجرتیں بڑھیں، اُس کے کام کے حالات بہتر ہوں۔ انسانی تاریخ، اپنی حالت بہتر بناتے رہنے کی تدابیر کی تاریخ رہی ہے۔ فرسودگی کے زمانوں سے لے کر آج کی ترقی یافتہ دنیا تک یہی سلسلہ رہا ہے۔ اور یہ سلسلہ بے انت ہے، بے کراں، لازوال اور ابدی ہے۔ سٹرگل کی یہ قسم بورژوازی کی نجی ملکیت کو چیلنج نہیں کرتی۔ مزدور ٹریڈ یونین میں منظّم ہو کر بس آنے ٹکے کی لڑائی لڑتے ہیں۔

یہ لازمی جدوجہد اصل نجات نہیں دیتی۔ یہ کیپٹلزم کو ختم نہیں کرتی۔ ورکنگ کلاس خود اپنی

کوششوں سے محض ٹریڈ یونین شعور پیدا کرنے کے قابل ہوتی ہے ۔ ہر ہڑتال میں سماجی انقلاب کے عناصر پوشیدہ ہوتے ہیں۔لیکن یہ سوچنا حماقت ہوگی کہ ہم ہڑتال سے براہِ راست انقلاب کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

اگر صرف یہی صورت رہے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ مزدور کی غلامی ابد تک رہے گی۔بس چھوٹی موٹی رعایتیں ملتی رہیں گی۔ٹریڈ یونین سٹرگل میں مزدور طبقاتی طور پر باشعور تو ہوسکتا ہے۔مگر حتمی آزادی حاصل نہیں کرسکتا۔ٹریڈ یونین کمیونسٹ پارٹی نہیں ہوتی۔مزدور،خودروطور پر اپنے حاکموں کا تختہ الٹنے کے قابل نہیں ہیں۔مزدور ٹریڈ یونین تو بنا سکتے ہیں،عمومی سیاسی تحریک کو تقویت تو دے سکتے ہیں مگر یہ سارے کام انہیں آٹومیٹک طور پر سیاسی پارٹی نہیں بناتے۔

ایک اور غضب لینن کے وقت یعنی 1903 سے لے کر آج تک یہ رہا کہ ٹریڈ یونین لیڈروں کو بورژوازی نے کرپٹ بنایا اور وہ خود پیٹی بورژوازی بن چکے ہیں۔

بنیادی نجات کے لیے تو اُسے اس طریقے کو بھی جاری رکھنا ہوگا،اور ساتھ ساتھ اپنے لیے دوسری راہیں بھی تلاش کرنی ہوں گی۔یعنی:

2۔ نظریاتی سٹرگل

طبقاتی جدوجہد کی سیاسی اور معاشی صورتیں اُس وقت تک مدہم اور مبہم ہی رہتی ہیں جب تک کہ انہیں نظریات کی قطب نما میسر نہ ہو۔نظریاتی سٹرگل کا مطلب بورژوازی کے نظریات کی استرداد اور اُس کا متبادل،عوامی نجات کا نظریہ فراہم کرنا ہوتا ہے۔

نظریہ کی فراہمی اس لیے ضروری ہے کہ جس وقت تاریخ میں پیداوار کے آلات ابتدائی اور فرسودہ صورت میں تھے۔تو انسان کو سماج کا شعور ہی نہ تھا۔ابتدائی انسان جو کچھ دیکھ اور سمجھ سکتا تھا،اُسی کے بہتر بنانے کو پورے معاشرے کا بہتر بنانا گردانتا تھا۔چنانچہ کسی نے کلچر کے بہتر بنانے کو سماج کا بہتر بنانا سمجھا،کسی نے خواتین کی حالت میں اصلاح کرنے کو،

اور زیادہ ترنے تو اخلاقیات کو۔ سماج کو مجموعی طور پر نہیں بلکہ ٹکڑوں میں بہتر بنانے والے اِن سارے فلاسفروں کو ''یوٹو پیائی'' فلاسفر کہتے ہیں۔

اس کے برعکس آج مزدوروں کا نظریہ ہمہ پہلو ہے ۔ یوٹو پیائی کے برعکس ہے۔ اسے مارکسزم کہتے ہیں۔

3۔سیاسی سٹرگل

یہ ہے اصل جدوجہد۔مقصد استحصالی نظام کو جڑ سے ہی ختم کرنے کی جدوجہد۔ یہاں صرف اجرتوں میں اضافے یا حالاتِ کار میں بہتری کی بات نہیں کی جاتی بلکہ مہنگائی، بے روزگاری، بے امنی، بے انصافی، اور بے جمہوریتی کے خلاف بات کرتے کرتے سیاسی اقتدار کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔اس نتیجے پر پہنچا جاتا ہے اقتدار بورژوازی سے لی جائے اور پرولتاریہ کے حوالے ہو۔

کلاس سٹرگل کی سیاسی شکل ورکنگ کلاس اور ساری سوسائٹی کو استحصال سے نجات دلانے کے لیے فیصلہ کن شرط ہے۔

سٹرگل کی معاشی اور نظریاتی صورتیں سیاسی سٹرگل کے اہداف کے ماتحت ہوتی ہیں۔

سیاسی پارٹی

یہ دولفظوں پر مشتمل ایک بہت ہی طاقتور مظہر ہے: سیاست اور پارٹی۔

سیاست کسی بھی سماج میں سب سے ارفع سماجی سرگرمی ہے۔ یہ محض ایکٹوازم کا نام نہیں ہے بلکہ یہ خود کو آگاہ اور باخبر رکھنا بھی ہے، حقائق کی پرواہ کرنا بھی ہے اور تبدیلی کے لیے کام کرنا بھی ہے۔ سیاست زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے۔

پارٹی ایک تنظیم ہوتی ہے جس میں سیاسی ہم فکر جمع ہوتے ہیں۔ تنظیم میں خود کو پرو دینے والے یہ لوگ اپنے طبقے کے مفاد کی رکھوالی کرنے والے بہت باخبر اور باشعور عناصر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے طبقے کے مفادات بیان کرتے ہیں اور اُن کی رہنمائی کرتے ہیں۔

آج کے انسان کی بہت بڑی اکثریت بین الاقوامی کپٹلزم کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ اس کپٹلزم میں دو ''بنیادی'' طبقات ہوتے ہیں پرولتاریہ اور بورژازی۔ اِن دونوں باہم متصادم طبقات کی سوچ، منشور اور تنظیمیں بہت مختلف ہوتی ہیں۔

بالائی اور حکمران طبقات کی سیاسی پارٹی کا جو بھی نام ہو، وہ بورژوا سیاسی پارٹی ہوتی ہے۔ اور نچلے محکوم محنت کش طبقے اور محکوم قوموں کی سیاسی پارٹی خواہ جس نام سے کام کرتی ہو، وہ پرولتاریہ کی پارٹی ہوتی ہے۔

1۔ بورژوا سیاسی پارٹی

ایسی سیاسی پارٹی کی جو منافع اور جائیداد کی حفاظت کرتی ہو۔

ایسی پارٹی میں کارخانہ دار، جاگیردار، سردار، پیر، اور ملاّ ہوتے ہیں۔ یہ اوپری استحصالی طبقہ کی پارٹی ہوتی ہے۔

کسی بھی ملک میں بورژوا پارٹیوں کے زیادہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سرمایہ دار طبقے کے اندر مختلف گروپ وجود رکھتے ہیں، اور حکومتی اقتدار پر براجمان ہونے کے لیے ان کی آپس میں کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ بورژوازی، ایک سے زیادہ پارٹیاں بنا کر مختلف چہروں اور نقابوں کو عوام کو دھوکہ دینے کے لیے بھی استعمال کرتی ہے تاکہ انہیں صاف اور کھلی طبقاتی جدوجہد سے باز رکھے۔ فاشسٹ پارٹیاں تو سرمایہ داری کو ضرب لگانے والے گروپ ہیں۔

اسی طرح بورژوازی، مزدور اشرافیہ سے کام لیتے ہوئے مزدوروں کو دھوکہ دینے کے لیے مزدوروں کے اندر بھی اصلاح پسند تنظیمیں بنانے کی بھی کوشش کرتی ہے۔

2۔ پرولتاریہ کی سیاسی پارٹی

مزدور طبقے کی سیاسی پارٹی محنت کشوں کے مفادات کی ترجمانی اور ان کے مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ مزدوروں کی سیاسی پارٹی ہی محنت کشوں کی جدوجہد کی تینوں صورتوں (معاشی سٹرگل، نظریاتی سٹرگل، اور سیاسی سٹرگل) کو بہت ہنرکاری سے استعمال

کرتی ہے۔

یہ پارٹی مزدوروں کے مفادات کے پیچھے پیچھے نہیں چلتی، بلکہ اس کے برعکس وہ ''پرولتاری طبقے کا ہراول اور راہنما ہوتی ہے''۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ساری ورکنگ کلاس، پارٹی سے تعلق نہیں رکھتی اور نہ اسے رکھنا چاہیے۔

پرولتاری پارٹی کے ممبر بننے کی شرائط:

ہر وہ شخص پارٹی ممبر بن سکتا ہے جو:

1۔ پارٹی کے پروگرام کو تسلیم کرتا ہو۔

2۔ پارٹی کو مالی طور پر مدد دیتا ہو۔

3۔ پارٹی تنظیموں میں سے ایک میں ذاتی طور پر حصہ لیتا ہو۔

پرولتاری پارٹی اپنی سرگرمیوں میں مارکسی لیننی علم، سماجی انقلابات، اور نئے معاشرے کی بنیاد کے علم کو اپنا رہنما بناتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ خود کے تجربے بھی اس کو مالا مال بناتے ہیں۔ ایسی پارٹی انقلابی علمی تھیوری، اور مضبوط تنظیمی اصولوں کے علم سے مسلح ہوتی ہے۔

مارکسی پارٹی مزدور طبقے کا متشکل دستہ بھی ہے۔ ایسا دستہ جو مارکسزم اور لینن ازم کے انقلابی افکار کی سچائی کی مشترک تلاش اس طبقے کے افراد کے ساتھ مل کر کرتی ہے۔ یہ مزدوروں میں سوشلسٹ علم کی مسلسل نشوونما اور پرورش کرنے کے لیے کام کرتی ہے۔ یہ مزدور طبقے کو بورژوازی کے فاسد نظریے کے اثر سے بچاتی ہے۔

مارکسی اور عوام کی حقیقی پارٹی محنت کش عوام کے وسیع حصوں کے ساتھ ہزاروں طریقوں کے ساتھ ربط رکھتی ہے۔ چونکہ پارٹی عوام کے مطالبات اور رجحانات کی مظہر اور ان کے بنیادی مفادات کے لیے مسلسل جدوجہد کرتی ہے اسی لیے اس کو عوام کی حمایت اور عوام کی امداد حاصل ہوتی ہے۔

یہ پارٹی ڈیموکریٹک سنٹرل ازم پر مبنی ہے۔ اس اصول پر سختی سے عمل کمیونسٹ پارٹیوں کی سرگرمیوں کا قابلِ دید قانون ہے۔ یہ اصول پارٹی کے دفاع، مزدور نظریہ کی مضبوطی، پارٹی ڈیموکریسی، اور اجتماعی قیادت کے اصول پر عمل کو یقینی بنائے رکھتی ہے۔ اس اصول پہ کاربند رہنے سے پارٹی کی قیادت کے ساتھ ارکان اور محنت کشوں کے ساتھ پارٹی کے رابطے کو یقینی بنانے اور قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور اسی اصول سے شخصیت پرستی جیسے زہر سے بچنے کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ اور اسی ڈیموکریٹک سنٹرل ازم کے اصول سے پارٹی کی صفوں میں تنقید اور خود تنقیدی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

ایسی پارٹیاں شخصیت پرستی کی سخت مخالف ہوتی ہیں۔ لیڈر کی پرستش یا پرسنیلٹی کلٹ تباہ کن ہوتی ہے۔ پرسنیلٹی کلٹ پارٹی کے رول کو کم کرتی ہے۔ یہ بیماری پارٹی اور محنت کش عوام کی تخلیقی سرگرمی کو گھٹاتی ہے۔ یہ اجتماعی لیڈرشپ کے ساتھ عدم مطابقت رکھتی ہے جو کہ پارٹی لیڈرشپ کا بلند ترین اصول ہے۔ لیڈر کی ممتاز اور نمایاں رول کو تسلیم کرنا تو اہم ہے۔ جو کہ وہ عوام الناس کی تحریک کو منظّم کرنے اور راہنمائی کرنے کی ایک عظیم اہلیت ہے۔ مگر لیڈر کو کوئی مخلوق الفطرت دیوتا بنا کر اُس کی عبادت کرنا کبیرہ خباثت ہے۔ لیڈر کو پارٹی سے بلند نہ سمجھا جائے۔ پرسنیلٹی کلٹ تاریخی واقعات برپا ہونے کو ممتاز شخصیت سے منسوب کرتا ہے۔ یہ حرکت مارکسزم سے دشمنی ہے۔

انقلابی پارٹی کا حتمی ہدف سوشلسٹ انقلاب ہوتا ہے۔ یعنی مزدور طبقے کی پارٹی اپنے اتحادیوں (کسانوں، محکوم قوموں) کے ساتھ مل کر کیپٹلزم کا خاتمہ کر کے اقتدار سنبھالنا۔ اہداف میں طبقاتی استحصال کو بند کرنا، قومی حقِ خود اختیاری بشمول حق علیحدگی دینا، عورتوں کو مساوی حقوق و مواقع دینا، اور رجعت پسندی کے خلاف مسلسل و پیہم جدوجہد شامل ہیں۔

صرف اور صرف تاریخی جدلیاتی سوچ کا مسلسل استعمال اِس پارٹی کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ یہ دائیں یا بائیں مہم پرستی کے خلاف تین کام کرتی ہے۔

1۔ ماکسزم لیننزم کا اپنے سارے اہداف اور جدوجہد پہ اطلاق کرتی ہے۔

2۔ پہنچے ہوئے فیصلوں کو عملی کرنے کے لیے ڈیموکریٹک سنٹرلزم کے اصول پہ چلتی ہے۔

3۔ لیفٹ سیکٹرین ازم اور رائیٹ موقع پرستی کے خلاف ایک نظریاتی جدوجہد چلائے رکھتی ہے۔

یہ پارٹی ورکنگ کلاس کا نہ صرف حصہ ہے، بلکہ یہ اُس کا باشعور اور منظّم ہراول ہے۔ یہ پارٹی کلاس آرگنائزیشن کی بلند ترین شکل ہوتی ہے۔

البتہ یہ ورکنگ کلاس پارٹی ہر ملک میں ایک ہی طرح سے کام نہیں کرتی۔ آمریت، مارشل لا، بادشاہت اور کٹھ ملائیت والے سماج میں یہ پارٹی انڈرگراؤنڈ رہ کر سیاست کرتی ہے۔ بورژوا جمہوریتوں میں یہ اوپن سرگرمیاں کرتی ہے۔

لیکن وہ خواہ جو بھی طریقے استعمال کرے، لازم ہے کہ وہ طریقے مارکسزم کے عمومی مزاج اور تعلیمات کے مطابق ہوں۔ اِس پارٹی کے پاس اس کی اپنی ایک اخلاقیات، نظریات کا اپنا ایک پیکیج، اپنے طرز کی ایک آرگنائزیشن، اور تنقید و خود تنقیدی کے اصول ہوتے ہیں۔

پارٹی پرولتاریہ کی تمام دوسری تنظیموں کی رہبری کرتی ہے۔ ایک آہنی ڈسپلن والی پارٹی، ایک فقید المثال اتحاد والی پارٹی، سائنسی نظریات سے لیس پارٹی۔۔۔۔ اور عوام کے ساتھ صمد بانڈ والا رشتہ رکھنے والی پارٹی۔

یہ انقلابی پارٹی ترکیب اور بناوٹ کے اعتبار سے دو حصوں پہ مشتمل ہوتی ہے:

1۔ ایک تو شعور اور ڈسپلن میں آگے بڑھے ہوئے پارٹی کارکنوں کا محدود اور باقاعدہ گروہ ہوتا ہے جو ''انقلاب پیشہ'' لوگ ہوں۔ یعنی وہ لوگ جن کا بغیر پارٹی کام کے اور کوئی پیشہ نہ ہو، اور جن کے اندر کافی نظریاتی علم، سیاسی تجربہ اور تنظیم کاری کی صلاحیت موجود ہو۔ اس گروہ میں وہی لوگ ہوتے ہیں جو انقلابی کام کو اپنا مستقل پیشہ بنا چکے ہوں۔ ایک

مطلق العنان حکومت کے اندر پارٹی کے ارکان کی تعداد کو جتنا زیادہ صرف انہی لوگوں تک محدود رکھا جائے اتنا اچھا ہے۔اس لیے کہ ''انقلاب پیشہ'' لوگوں کے اس ادارہ کو توڑنا مشکل ہوگا۔ایسے ارکان کو عرفِ عام میں ''ہول ٹائمرز'' کہتے ہیں۔

پیشہ ور انقلابی کو عوام کی انتہائی گہرائیوں تک جانا ہوتا ہے، اُسے عوام کی ضرورتوں اور مزاج کی سمجھ حاصل کرنی ہوتی ہے۔ پروفیشنل انقلابی ہر طرح کے جبر وتشدد اور ظلم کے مظہر پر آواز بلند کرتا ہے۔اس کے پاس ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو اس طرح استعمال کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے سوشلسٹ نظریے اور جمہوری مطالبات کو سب کے سامنے لا سکتا ہے۔ وہ سب سے اور ہر ایک سے پرولتاریہ کی جدوجہدِ آزادی کی عالمی تاریخی اہمیت کی وضاحت کرسکتا ہے۔

پارٹی ممبر انقلابی ڈپریشن کے زمانے میں پارٹی وقار، اور پارٹی عزت کو بچانے کے لیے ہمہ وقت تیار ہوتا ہے۔اور جب ضرورت پڑے تو قومی سطح کے ایک مسلح ابھار تک کے لیے تیار رہنے، اُس کا منصوبہ بنانے، اور عملی بنانے کا اہل ہوتا ہے۔

اِن ہول ٹائمرز کے پاس ضروری نظریاتی تعلیم، سیاسی تجربہ، اور تنظیمی مہارت ہوتی ہے۔ہول ٹائمرز گویا پارٹی کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔

2۔ پارٹی کا دوسرا حصہ پارٹی کے مقامی اداروں کا پھیلا ہوا جال ہوتا ہے، اور پارٹی کے عام ممبروں کی ایک بہت بڑی تعداد پہ مشتمل ہوتا ہے جن کو لاکھوں مزدوروں کی ہمدردی اور مدد حاصل ہوتی ہے۔

پارٹی کی لوکل اور ضلع کمیٹیاں ہوتی ہیں۔اسی طرح صوبائی اور سنٹرل کمیٹی ہوتی ہے

۔

انقلابی پارٹی ہر پانچ برس بعد اپنی کانگریس منعقد کرتی ہے ۔ دراصل پارٹی

کانگریس ہی ورکنگ کلاس پارٹی کا سب سے اعلیٰ اور اتھارٹی والا ادارہ ہوتی ہے۔

کانگریس میں دو کام ہوتے ہیں:

i۔اگلے پانچ سال کے لیے پارٹی پالیسیاں، سیاست اور تنظیم متعین ہوتی ہے۔

پہلا قدم تو یہ ہوتا ہے کہ کانگریس سے کئی ماہ پہلے سنٹرل کمیٹی کی طرف سے تیار کردہ قرار دادیں اور سیکرٹری جنرل رپورٹ غیر حتمی مسودے کی شکل میں پارٹی شاخوں کو بھیجی جاتی ہیں۔اس طرح اِن مسودات پر کانگریس کے انعقاد سے کئی ماہ قبل پارٹی کے اداروں اور علاقوں میں ایک زبردست بحث مباحثہ چلتا ہے۔اس بحث میں پارٹی کے سارے ممبر، کمیٹیاں اور پارٹی کی ماس تنظیمیں حصہ لیتی ہیں۔ وہ پارٹی پالیسی، نظریہ، سیاست اور تنظیم کے مسودے میں تبدیلیاں، اور اضافے تجویز کرتی ہیں۔

اختلافی معاملات پر پارٹی کے اندر ووٹنگ ہوتی ہے۔اور اس ووٹنگ میں جس گروہ کو شکست ہوتی ہے، اسی میں سے ایک کو اب متفقہ اور حتمی منظور کردہ قرارداد لکھنے کو دی جاتی ہے۔

''مرکزی قرارداد کمیٹی'' موصول شدہ ان تجاویز کو اس طرح منظّم کرتی ہے کہ جب کانگریس منعقد ہو تو وہاں بحث کو مزید مرکوز کیا جاسکے۔ چونکہ اس قدر مفصل بحث کو صرف دو تین روزہ کانگریس میں سمیٹنا ممکن نہیں ہوتا۔اس لیے اِس پراسیس کے ذریعے کانگریس میں پہلے ہی زیادہ سے زیادہ اتفاقِ رائے پیدا جاتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس پراسیس سے گزرنے کے بعد اِن مسودات کو مزید اتفاقِ رائے پیدا کرنے، اور حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے کانگریس کے تین چار دن کافی ہوتے ہیں۔

ii۔کانگریس پختہ کار اور مستحکم انقلابیوں پہ مشتمل ایک سنٹرل کمیٹی منتخب کرتی ہے۔ پانچ سال بعد اگلی کانگریس کے انعقاد تک یہ سنٹرل کمیٹی پارٹی چلاتی ہے۔

کانگریس میں پارٹی اخبار کے لیے ایڈیٹوریل بورڈ منتخب کیا جاتا ہے۔ جو عموماً تین ممبرز پر مشتمل ہوتا ہے۔

پارٹی کے یہ تمام ادارے منتخب ہوتے ہیں۔

پارٹی کے تمام ادارے مرکز کے تابع ہوتے ہیں۔ نچلے ادارے اوپری اداروں کے ،اور اقلیت اکثریت کی تابع ہوتی ہے ۔ پارٹی کے اندر شعوری اور مضبوط ڈسپلن ہوتا ہے جو پارٹی کے سب ارکان کے لیے یعنی اوپر سے نیچے سب کے لیے بغیر کسی استثناء کے ایک ہی طرح کا ہے۔ڈیموکریسی اور سنٹرل ازم پارٹی کی داخلی زندگی میں ایک واحد اصول کے دو پہلو بنتے ہیں اور اس پر مکمل طور پر عمل کیا جانا پارٹی کی داخلی زندگی کے لیے ضروری شرط سمجھی جاتی ہے۔

پارٹی ڈیموکریسی کے معنی یہ ہیں کہ

1۔ پارٹی کی رہنمائی کرنے والے تمام ادارے اوپر سے نیچے تک منتخب ہوتے ہیں۔

2۔ پارٹی میٹنگوں میں پارٹی کے قوائد کے مطابق سیاسی اور تنظیمی مسائل کے اٹھانے اور ان پر بحث کرنے کا حق پارٹی کے تمام ارکان رکھتے ہیں اور یہ حق ختم نہیں کیا جاسکتا

۔

پارٹی اخبار

تاریخ میں جہاں جہاں انقلابی پارٹی بنی وہ اپنے اخبار ہی کے ذریعے بنی۔ پارٹی اخبار مندرجہ ذیل کام کرتا رہا ہے:

* یہ عوام اور پارٹی کے درمیان ، پارٹی کارکنوں کے اپنے درمیان ،اور پارٹی کارکنوں اور لیڈرشپ کے درمیان رابطے کا ہتھیار ہے۔
* نظریاتی ستھرائی کو بڑھاوا دینے کا زبردست کام۔
* یہ روزمرہ سیاست میں بہتر سائنسی موقف اپنانے میں راہنمایانہ رول ادا کرتا

ہے۔

* یہ پارٹی ورکرز کے لیے تازہ آکسیجن کا کام دیتا ہے۔
* اس سے پارٹی اتحاد، ڈسپلن اور تنظیم کو زبردست تقویت ملتی ہے۔
* اخبار پارٹی پروپیگنڈہ کا ایک مسلسل ہتھیار ہے۔
* ایجی ٹیشن کے زمانوں میں پارٹی اخبار، بالخصوص روزنامہ اخبار بہت موثر ہوتا ہے۔
* کبھی کبھی تو مختلف جگہوں پر پارٹی اخبار کے نمائندوں ہی پر پارٹی استوار کی گئی۔

چنانچہ ہر ممبر کے لیے پارٹی اخبار کا نہ صرف انفرادی طور پر پڑھنا ضروری ڈیوٹی ہوتا ہے بلکہ اسے پارٹی کمیٹیوں اور یونٹوں میں پڑھنا اور اس پہ بحث کروانا بھی لازمی ہوتا ہے۔ المختصر، پارٹی اخبار پارٹی کی لائف لائن ہوتا ہے۔

پارٹی کے خلاف سازشیں

طبقاتی کشمکش سماج میں ارتقا اور انقلاب کا بنیادی سبب ہوتی ہے ۔مگر یہ طبقاتی کشمکش اکیلی انقلاب نہیں لاسکتی ۔سماجی تبدیلی یا انقلاب ایسے ہی ''سَٹی'' میں نہیں آتے ۔موزوں حالات کا ایک مجموعہ آجاتا ہے جب تبدیلی کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔اُن میں سے ایک تو یہ ہے کہ محنت کرنے والا طبقہ نظام میں نشوونما پاتے پاتے ایک خاص مرحلے میں مالک طبقات کے قائم کیے ہوئے سارے نظام کے ساتھ متصادم ہونے لگتا ہے اور یہ سارا نظام اِن محنت کرنے والوں کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتا ہے تب اُس سارے نظام کو ڈھادینے کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں رہ جاتی ۔ کیونکہ محنت کرنے والے بہت ترقی کرجاتے

ہیں اور نظام اُن کے لیے وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ جب دونوں میں مطابقت نہیں رہتی تو ارتقا رک جاتا ہے۔ اور ارتقا کے بغیر تو زندگی ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ محنت کرنے والوں اور نظام میں، مطابقت پیدا کرنے کے لیے سماجی انقلاب کا برپا ہونا لازمی بن جاتا ہے۔ تب یہ نظام ٹوٹ جاتا ہے، اور محنت کرنے والوں کے ارتقا کی سطح کی مطابقت میں اور ارتقا پذیری کو مہمیز دینے والا نظام قائم ہوجاتا ہے۔ دونوں کی مطابقت میں پیداواری قوتوں کی نشوونما ہونے لگتی ہے۔ تب سماجی تبدیلی کا دور شروع ہوتا ہے۔

حکمران طبقات نہ صرف اپنی ملکیت اور ملکیتی اقتدار کے لیے لڑتے ہیں بلکہ اپنی اس طبقاتی لڑائی میں ریاست کو بھی گھسیٹ لاتے ہیں۔ یعنی عدلیہ، میڈیا، فوج، اسمبلی، پنڈت، پیر، اور بورژوا دانشور سب اس لڑائی میں اعلانیہ شامل ہوجاتے ہیں۔ یوں خود ریاست طبقاتی جدوجہد میں ایک ہتھیار کے بطور بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ اب بورژوا حکمرانی کی برقراری کے لیے ریاست ایک اہم ہتھیار بن جاتی ہے۔ یعنی لُٹ جانے والا طبقہ اپنے شعور، آرگنائزیشن اور کثیر تعداد کے بل بوتے پر بالادست طبقہ کو اقتدار سے بے دخل کرنا چاہتا ہے اور حکمران طبقہ اپنی پوری ریاستی مشینری کی مدد سے اُن کی ''بغاوت'' کو کچل ڈالنے کی لڑائی لڑتا ہے۔

یہ تو معلوم بات ہے کہ کسی بھی جدوجہد، بغاوت، الیکشن یا انقلاب کا بنیادی سوال ریاستی اقتدار پر قبضے کا سوال ہے۔ باقی تو بس زیبِ داستان ہے۔ کسی بھی انقلاب کی روح اقتدار کا حصول ہے۔

صرف بنیادی انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے ہی پرانے رجعت پرستانہ سماجی نظام کو ختم کیا جاسکتا ہے اور ایک نئے پروگریسو سماجی نظام کو نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اور وہ معاشی اور طبقاتی تضادات جو پرانے سماج کی ترقی کے طویل دور میں پختہ اور گہرے ہوتے ہیں۔ انہیں سماجی انقلاب کے بغیر حل نہیں کیا جاسکتا۔

سماجی انقلاب سماجی زندگی میں زبردست اہمیت رکھتے ہیں۔ سماجی انقلاب کے دوران عوام کی تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور وہ تبدیلیوں میں باشعور اور بامقصد حصہ لیتے ہیں۔ سماج کی تبدیلی کا عمل سماجی انقلاب کے باعث تیز ہوجاتا ہے۔

ماضی میں بھی، اور مستقبل میں بھی کافی عرصے تک انقلاب ایک بدبخت خونریزی (انقلاب سے پہلے، انقلاب کے دوران، یا بعد از انقلاب) کے بغیر ممکن نہیں۔ لکھ کر لیجیے کہ انقلاب پوسٹ آفس میں خط ڈالنے کا نام نہیں ہے کہ وہ خود بخود آگے ڈلیور ہوجائے گا۔ نہ ہی انقلاب کسی لیڈر کی مرضی کا محتاج ہے کہ حکم دیا ''ہوجا انقلاب'' اور ''ہوگیا انقلاب''۔ انقلاب ہوتا نہیں، لایا جاتا ہے۔

انقلاب اپنے آپریٹروں کی آنتیں جلاتا ہے۔ آنا نہ آنا تو الگ بات۔ اور اگر کہیں انقلاب آجائے تو اُس عہد کے لوگوں کے لیے اپنے پیش رو جُہد کاروں کو فراموش کرنا ناممکن ہوتا ہے۔

طبقاتی کشمکش کی انقلاب میں صفتی تبدیلی کے لیے کچھ شرائط کا پورا ہونا لازمی ہے۔ استثنائیں اپنی جگہ مگر قانون یہ ہے کہ کچھ لوازمات کی تکمیل کے بغیر تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ انہیں ''انقلابی صورتحال'' بھی کہا جاتا ہے۔ اور یہ ''انقلابی صورتحال'' چار شرائط کے پورا ہونے سے مشروط ہے:

1۔ نچلی کلاسز پرانے طرز سے مکمل بیزار ہوجاتی ہوں۔

2۔ بالائی حکمران کلاسز پرانے نظام کو برقرار نہ رکھ سکتے ہوں۔

3۔ ورکنگ کلاس کی سیاسی پارٹی اقتدار لینے کے لیے تیار اور پرجوش ہو۔ یعنی ورکنگ کلاس حکمران کلاس سے لڑنے کے لیے تیار ہو۔

سماجی انقلاب کے لیے کلاس فورسز کا توازن دیکھنے کے علاوہ ایک ضروری چیز ورکنگ کلاس صفوں کی مضبوط حالت ہے۔ ضروری ہے کہ ورکنگ کلاس کے پاس انقلاب کی قیادت کے لیے ایک اہل، تجربہ کار اور منجھی ہوئی منظّم سیاسی پارٹی ہو۔ ورکنگ کلاس بطور ایک کلاس کپٹلزم کے بارے میں سارے واہموں کو جھٹک چکی ہو، ریفارمزم کے نظریے اور

پالیسیوں کو مسترد کرتی ہو۔ بڑے پیمانے پر انقلابی کاروائی کے لیے تیار کھڑی ہو۔ یعنی وہ کلاس سیاسی طور پر باشعور سیاسی پارٹی میں منظّم ہو، معاشی طور پر مفلوج، اور اپنی حالت بدلنے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو۔ اور اُس نے ایسی ہی حالت میں موجود دوسرے لوگوں یعنی ،کسانوں، عورتوں، مظلوم قومیتوں اور روشن فکر دانشوروں سے پکا اتحاد کر لیا ہو۔ اِس سارے پیراگراف کو ''موضوعی صورتحال'' کہتے ہیں۔

ویسی موضوعی صورتحال موجود نہ ہو تو انقلابی صورتحال بھی موجود نہیں ہوتی۔

انقلابی سیاسی پارٹی کی مضبوطی انقلاب کی ایک لازمی شرط ہے۔

4۔اوپر بیان کردہ تینوں شرائط سماج کے'' اندرونی ''لوازمات تھے جو ایک سماجی انقلاب کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ایک ڈھائی ویں شرط بھی بہت اہم ہوتی جارہی ہے۔وہ ہے ''بیرونی صورت حال کا موافق ہونا''۔اب تو سوشلسٹ کیمپ کی 1990 کی دھائی میں تباہی کے بعد بالخصوص کپٹلسٹ دنیا اس قدر مضبوط و منظّم و جنگجو ہو چکی ہے کہ اس بیرونی صورتحال کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

یہ طریقہ ہر معاشرے کو خود ڈھونڈنا ہوگا۔اب بیسویں نہیں، اکیسویں صدی ہے ۔بیسویں صدی میں سوشلسٹ انقلابات لائے گئے تھے اور غیر معمولی مشکل صورتحال میں سوشلزم کی تعمیر کی کوششیں ہوئی تھیں۔ وہاں زبردست حاصلات ہوئی تھیں، غلطیاں، کوتاہیاں بھی بڑی بڑی ہوئی تھیں، اور بالآخر شکستیں بھی۔ یہ سب اکیسویں صدی کے انسان کے لیے تجربات ہیں، سبق ہیں۔بیسویں صدی میں سامراج کی گرفت اس قدر مضبوط نہ تھی جتنی اب ہے۔ وہاں سامراج کو وہ سائنس اور ٹکنالوجی دستیاب نہ تھی جو آج کے سامراج کو ہے۔اور اُس وقت ایک سوویت یونین موجود تھا جواب نہیں ہے۔

اب کسی بھی ملک کے سماجی انقلاب اور اس کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہو گیا ہے کہ کپٹلسٹ کیمپ کا اتحاد ڈھیلا پڑ جائے، وہ انتشار کی کیفیت میں مبتلا ہو۔اور یہ بھی ضروری ہے کہ عالمی مزدور تحریک آپ کے انقلاب کا ساتھ دے۔

اسی طرح ہم نے دیکھا کہ غلام داری سماج کا لباس، نظریہ اور قوانین اگلے سماج کے آتے ہی رفو چکر ہو گئے۔اس کا یہ مطلب بھی نکلا کہ قوانین، نظریات اور عقیدے حتمی اور ابدی نہیں ہوتے بلکہ ہر موڈ آف پروڈکشن پچھلوں کی بیٹری ڈبو کر اپنے نئے نظریات ساتھ لاتا ہے۔اس لیے جو لوگ فیوڈلزم کے دور کی غیرت، لباس، اور طور طریقے کپٹلزم میں ڈھونڈتے ہیں وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ انسانی حقوق کا چارٹر، عورتوں کا بیجنگ اعلان نامہ، اور یونائٹڈ نیشنز کے ریزولیوشنز غلام داری سماج میں تو نہیں لکھے جاسکتے تھے ناں!۔

سماج کے طبقاتی ڈھانچے میں ریڈیکل تبدیلی اپنی مطابقت میں کلاس سٹرگل کی شکلوں میں تبدیلی کو متعین کرتی ہے۔کپٹلزم سے سوشلزم کی طرف عبور کے پیریڈ میں کلاس سٹرگل رک نہیں جاتی، بلکہ اس کے معین کردہ کام، شکلیں اور ذرائع آبجیکٹو صورتحال کے مطابق لازمی تبدیلی سے گزرتے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر اس حقیقت کے سبب ہے کہ ''اب'' ریاست جیسے طاقتور ہتھیار کے مالک کے بطور ورکنگ کلاس بطور حکمران طبقہ سٹرگل کرتا ہے۔اب سٹرگل کے متعین کردہ کام بھی مختلف ہوتے ہیں۔دو اہم یہ ہیں: پہلا استحصال کرنے والوں کے خلاف لڑنا، اُن کی مزاحمت کو دبانا، اور آخر میں انہیں ختم کرنا۔دوسرا، نئے سوشلسٹ نظام کو تُندی اور تن دہی کے ساتھ عوام میں لے جانا۔

ہاں البتہ اس غلط فہمی میں نہ رہیے کہ چونکہ آج کے ترقی یافتہ کپٹلزم میں سوشلزم ایک معروضی لازمیت ہے اس لیے یہ خود بخود، آٹومیٹک طور پر ہو کر رہے گا۔نہیں۔ ورکنگ کلاس آبجیکٹو اور سبجیکٹو حالات کو مناسب دیکھ کر (اور بنا کر) شعوری سرگرمی کرے گی تو تبدیلی آئے گی۔

ہمارے ہاں دنیا میں جدید طرز کی سیاسی پارٹی (کمیونسٹ پارٹی) کو سماجی تبدیلی کی جدوجہد کرتے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرا ہے۔مگر اس کے باوجود انقلاب ابھی تک ہاتھ

نہ آیا۔

سماج پی ٹی کلاس نہیں ہوتا کہ سیٹی بجے تو اٹنشن ہوجائے، اور سیٹی بجے تو سٹینڈ ایٹ ایز ہوجائے۔۔سماج کسی ماسٹر، ہیڈ ماسٹر کو نہیں مانتا۔ وہ اپنے سے باہر اور اپنے سے اوپر کی ہر چیز کے سامنے اندھا، بہرا اور بے حس ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنی ضرورتوں کو نقارے کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے وقت ہی حرکت کرتا ہے۔ اور عام تصور کے برعکس، سماج کبھی کبھی حتیٰ کہ اپنی ضروری ترین ضرورت یعنی معاشیات کی بھی آٹومیٹک انداز میں تابعداری نہیں کرتا۔

تاریخ دیکھے تو معلوم ہوگا کہ انقلاب کے خلاف سکوت و جمود کی بادشاہی بہت دیر تک جاری رہی۔ جیسا کہ لینن نے کہا تھا کہ: ''دسیوں سال ایسے گزر جاتے ہیں کہ کچھ بھی وقوع پذیر نہیں ہوتا، اور پھر چند ہفتوں کے اندر دسیوں سالوں والے واقعات ہوجاتے ہیں''۔ ہم نے اب تک یہی دیکھا۔ اور ہمارے عوام وہ دن بھی دیکھیں گے جب ذرا سا غلاف ہٹے اور معاشرہ پھٹ پڑے۔ مطلب یہ کہ اضداد کا توازن کبھی مطلق نہیں ہوتا، اضداد کی کشمکش کبھی نہیں رکتی۔ کوئی منت سماجت، کوئی میٹر ھ مرکہ اس تصادم و کشمکش میں مفاہمت پیدا نہیں کرسکتا۔ آقا اور غلام میں طاقت اور کمزوری تو ہوسکتی ہے مگر باہم امن نہیں ہوسکتا، اسی طرح فیوڈل ازم میں کسان اور فیوڈل کے بیچ طاقتوری اور کمزوری تو ہوسکتی ہے مگر باہم امن نہیں ہوسکتا جب تک کہ فیوڈلزم ختم نہیں ہوتا۔ ملا، پادری، اور پیر سب کی کرامتوں، تعویذوں، دعاؤں اور جادوگر کے رقص کرنے اور پارسا کے دم چُھو کے باوجود فیوڈلزم نے مرجانا ہوتا ہے۔ کیپٹلزم میں بھی کیپٹلسٹ اور مزدور کے بیچ وقتی طاقتوری و کمزوری تو ہوسکتی ہے مگر باہم امن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ کیپٹلزم ختم نہ ہوجائے۔

دوسرے ممالک میں تبدیلیوں کی مثالیں دیتے وقت ایک بات یاد رکھنے کی ہے۔ کسی بھی دو ملکوں کی سیاستیں ہو بہو ایک طرح نہیں ہوتیں۔ چنانچہ ممالک کے انقلابات ایک دوسرے سے ملتے جُلتے ہونے کے باوجود بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ہر انقلاب کا اپنا مزاج

ہوتا ہے، اپنی اپنی سست یا تیز رفتاریاں ہوتی ہیں۔ اُن کی جیومیٹریاں تک مختلف ہوتی ہیں۔ ہر انقلاب کے راستے اُس کے اپنے کھڈے اور رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ ہر سماج اپنے اپنے واقعات سے حاملہ ہوتا ہے۔ اس لیے کسی دوسرے انقلاب کی نقل کرنا تباہ کن ہوتا ہے۔

ہمارے جیسے ایک بنیاد پرست اور مارشل لا زدہ سماج میں پارلیمانی سیاست کرنا تک ایک پل صراطی کام ہے۔ بالخصوص، جب سیاست ہی کو جھوٹ، منافقت، ٹھگی، لفنگائی اور کاروبار مشہور کیا گیا ہو۔ ہمارے ہاں کی آج کی سیاست حتمی طور پر غیر سیاسی پن (جو خود ایک سیاست ہے) کے نرغے میں ہے۔ بہت استادی کے ساتھ سیاست کو شیطانی کام مشہور کردیا گیا ہے۔ اسے سمگلروں کا کام، بھتہ خوروں، اور بے ضمیروں کا کام قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ادبی اور علمی میدان میں بھی ایسے فقرے ضرب الامثال کے بطور عام ملتے ہیں: ہمارے ساتھ سیاست نہیں کر۔ فلاں معاملے کو سیاست سے بالاتر ہوکر دیکھنا چاہیے، فلاں کام سیاست کی نذر ہوگیا ہے۔

ایسے ماحول اور سماج میں ایک سیاسی ورکر کا ملنا ہی غنیمت ہوتا ہے۔

بورژوازی ایک اور کام بھی کرتی ہے:

عوامی سیاسی ورکر اور لیڈر کو خراب بتانا۔ سرکار و سردار اپنے اپنے رجمنٹوں کو سب کو ''گندا'' ثابت کرنے پر لگاتے ہیں۔ سب خراب ہیں، سب کرپٹ ہیں، سب ''اِس کے'' یا ''اُس کے'' غدار ہیں۔ کبھی کبھی کسی مرحوم شخصیت کی تعریفیں کرکر کے، اسے واحد نجات دھندہ قرار دے کر اُس کی آڑ میں باقیوں کو ایجنٹ ثابت کیا جاتا ہے۔ بس سب خراب ہیں۔ اُن کی طرف سے کسی بھی عوامی سیاسی ورکر، یا رہنما کو غیر متنازعہ رہنے نہیں دیا جاتا۔ سب کو متنازعہ بنادیا جاتا ہے۔ یہ آج کا نہیں، بہت پرانا دھندہ ہے۔ اب اکیسویں صدی میں تو صرف ''روس کی ایجنٹی'' کا لیبل ختم ہوا۔ باقی ساری تہمتیں، ساری سیاہ رنگیاں، ساری

سیاہ بختیاں باقی ہیں۔سرکار آپ کو متنازعہ بنادیتی ہے۔سردار متنازعہ بنادیتا ہے۔اِن کے دانشور کارندے آپ کو متنازعہ بنادیتے ہیں۔رائٹ کا ادارہ بنے دانشور ایسا کرتے ہیں، فریب دِہ انقلابی چوغوں میں ملبوس بہروپیے ایسا کرتے ہیں۔کبھی ''خواہ مخواہ'' والے لوگ یہ ٹائم پاسی کرتے ہیں۔حتیٰ کہ جینوئن انقلابی لوگ تک ایک دوسرے کو متنازعہ بناڈالتے ہیں۔

اس سب کا اصل مقصد سیاست کو خراب بتانا ہے۔اب چونکہ سیاست ہی خراب ہے تو موروثی حاکمیت کا متبادل گویا پیدا ہی نہیں ہوگا۔جان جائیے کہ خان کلات اور نواب خاران کی موروثی حاکمیت صرف اور صرف سیاست سے تبدیل کی جاسکتی ہے۔یہ سیاست خواہ زمین دوز ہو، سطح زمین پہ ہو، پارلیمانی، یا غیر پارلیمانی ہو، وفاقی ہو یا قومی اور صوبائی۔

بورژوا دانشوروں کے بقول سیاست تو خراب ہے، چنانچہ آج تیسری دنیا میں عوام کے پاس بادشاہ کا متبادل موجود نہیں ہے، جام کا متبادل، جرنیل کا متبادل، نواب کا متبادل اور پیر، ملّا کا متبادل موجود نہیں۔متبادل سب کے سب متنازعہ۔اس لیے اپنا پرانا بادشاہ اور وہی اپنا سردار ہی غنیمت ہے، اُسی پہ صبر شکر کرو۔

جو ''سٹیٹس کو'' متبادل قیادت اور سیاست کو متنازعہ نہ بنا پائے، وہ ناکام ''سٹیٹس کو'' ہوتا ہے۔

آج موجود سوشل میڈیا نے متنازعہ سازی کے اس کام کو بہت آسان کردیا ہے۔نیز انقلابی تحریک کی غیر منظمی نے بھی بورژوا دانشوروں کے اس کام کو بہت آسان بنادیا ہے۔

گو کہ انقلابی دانشوروں کا حق ہے کہ وہ تجزیہ کرکے بتادیں کہ فلاں پارٹی بورژوا ہے، اور فلاں انقلابی۔یہ بھی کہ فلاں لیڈر بورژوا ہے یا انقلابی۔مگر پرابلم پھر یہ بنتا ہے

کہ آیا ہم ''متنازعہ'' والے مقصد کو ہٹا کر اس طرح کرسکتے ہیں۔اپنے آزادانہ تجزیہ سے لفظ ''متنازعہ'' ہٹا سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں؟۔کیا ہم Perception کے پردوں کو چیر کر سیاست کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اور پھر حقیقت جان کر اسے عوام الناس میں مروج کرسکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ کاش ایسا ہو۔

اب تو کلاس اینگل دیکھنا بالکل ترک کردیا گیا ہے۔حیرت ہے کہ یہ عینک نہ رہے تو تجزیہ کیسا؟۔اور جو دانشور تجزیہ نہ کرسکے تو یقین کیجیے کہ وہ سیاست کے رنگین میدان میں ہر رنگ کا مشیر بنا پھرتا ہوگا۔تجزیہ نہ ہوگا تو تیسری رائے کیسے بنے گی؟۔لوئر کلاس کی پارٹی کیسے بنے گی۔

دنیا بھر میں ہمیشہ سے حکمران کلاسز نے بہت احتیاط سے تبدیلی کا ہر دریچہ بند کردیا ہوتا ہے۔ہر طرح سے ورکنگ کلاس پارٹی کے بننے، منظّم ہونے اور عمل کرنے کی راہیں سمینٹ کی جاچکی ہوتی ہیں۔تیسری دنیا میں بہت بندوبست سے یہ کام کیا جاچکا ہے۔اس معاملے میں بہت خون آشام تاریخ کے باوجود حالات مثبت کی طرف بڑھنے سے کھٹور پن کے ساتھ انکاری ہیں۔

لہذا مایوسی فطری ہے۔چاروں طرف سے، اور آٹھوں پہر ہم ہر دانشور سے ایسی باتیں سنتے رہتے ہیں۔

مخالف طبقہ کی مضبوطی، چابکدستی اور ہوشمندی، خبرداری بھی اپنی جگہ، مگر ہمارے مڈل کلاس دانشور بھی چیزوں کا ادراک درست طریقے سے نہیں کر پارہے ہیں۔بلاشبہ بلوچستان جیسے بچھڑے اور پچھڑے سماج میں فرد کا رول بہت زیادہ ہوتا ہے۔مگر لکھاریوں کی جانب سے شاید فرد کا یہ رول کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیا جارہا ہوتا ہے۔حالانکہ تبدیلی اور انقلاب فرد نہیں، عوام لاتے ہیں۔مگر وہ بھی بٹن آن بٹن آف والی قدرت نہیں رکھتے۔نہ

ہی وہ کسی کی فرمائش یا حکم سے ایسا کرتے ہیں۔

عوام کا مطلب ہی محنت کرنے والے عوام ہیں۔اور چونکہ حالیہ تاریخ میں دنیا بھر کے اندر طبقاتی نظام چلتا آرہا ہے اس لیے عوام کا مطلب استحصال شدہ محنت کنندہ عوام ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ غاروں کے اولین آدمی سے لے کر اکیسویں صدی کی ترقی یافتہ دنیا تک پہنچنے کی ساری تاریخ محنت اور پیداوار کے دم قدم سے ہے۔ساری فنی ترقی محنتی عوام کے دم سے ہے۔ ذرا غور کریں تو وہ صرف فنی ترقی کے بانی نہیں ہوتے بلکہ فنی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی تبدیلیوں کے بانی بھی عوام ہیں۔غلامی کے خلاف ساری جدوجہدیں عوام نے کیں، فیوڈلزم کو عوام کے علاوہ کون توڑ سکتا تھا۔اسی طرح عوامی ایجادات نے سائنسی دنیا کی تاریخ بنادی۔ایک عام ہل سے لے کر ہیوی انڈسٹری تک، اور فلسفہ کے الف بے سے لے کر اُس کے معراج یعنی مارکسزم تک سب کچھ محنت کرنے والے عوام اور اُس کے طرفدار دانشور نے مرتب کیا ہے۔حقوق کے لیے انفرادی لڑائی سے لے کر طبقاتی جدوجہد تک آپ کو عوام ہی نظر آئیں گے۔

اسی تاریخ سازی میں وہ ایسے افراد بھی پیدا کرتے ہیں جو کسی فیلڈ میں راہنمائی کا رول ادا کر سکتے ہیں۔ یہ جو ہمیں ''عظیم'' افراد نظر آتے ہیں، یہ آسمان سے نہیں آتے۔نہ ہی وہ اتفاقاً پیدا ہوتے ہیں۔تین باتیں اہم ہیں: عوام، تاریخی ضرورت، اور لیڈر۔ایک دوسرے سے سختی سے جڑی یہ تکون کبھی الگ نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے جان بوجھ کر لیڈر آخر میں لکھا ہے ۔اِس لیے کہ عوام اور تاریخی ضرورت موجود ہو تو لیڈر نے ضرور پیدا ہونا ہوتا ہے۔ یہ لیڈر نہیں تو وہ لیڈر، فلاں نہیں تو فلاں۔ وہ لیڈر خواہ زبردست ہو یا کم صلاحیت والا، لیکن اُس نے پیدا ہونا ہی ہے۔اس لیے کہ عوام اور تاریخی ضرورت اپنی سہولت کے لیے ایسا کرواتے ہیں۔اس لیے کسی طرح کی ہیرو پرستی اور شخصیت پرستی میں گرفتار نہیں ہونا چاہیے۔

سماج کے قوانین ہمارے یا ہمارے لیڈر کے مزاجوں کے اتار چڑھاؤ کے محتاج

نہیں ہوتے۔ضروری ہے کہ جدید اور سائنسی اصولوں کے ساتھ ساری ممکنات کو برانگیخت کرنے کا کام جاری رکھا جائے۔عوام الناس کے ساتھ رہتے ہوئے اُنہیں جامع طور پر تیار کرنے اور انہیں سارے اوزاروں سے لیس کرنے کا کام جاری رکھا جائے۔

چونکہ ایک عرصے سے اس خطے کا دانشور لفظ ''حکمران طبقات'' کا استعمال ترک کر چکا ہے۔اسی وجہ سے وہ ہر بار کسی نئے گھڑے ہوئے بُت کو نجات دھندہ قرار دے کر اُس کے قصیدے پڑھنے لگ جاتا ہے۔''حکمران طبقات'' اتنا اہم لفظ ہے کہ دنیا بھر میں جس سیاسی ورکر اور دانشور نے اُسے ترک کیا، بھٹکتے رہنا اُس کا مقدر بنا۔ یہی کچھ ہمارے خطے میں ہوا۔ہم یہاں اس اصطلاح کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھے ہیں۔اسی وجہ سے تو ہم دو آپشنوں پہ لٹکے چلے آرہے ہیں: مارشل لا، یا ''بورژوا جمہوریت''۔

ظاہر ہے کہ ہر باشعور اور آزاد فکر انسان مارشل لا سے دور بھاگے گا۔اور جمہوریت کے حق میں جائے گا۔اس لیے کہ یہاں مارشل لاؤں نے فیوڈلزم کو اپنا کر ہمارے معاشرے کے تار و پود اکھیڑ رکھے ہیں۔

مگر اس معاملے میں مارشل لا والے کبھی اکیلے نہ تھے۔عدالت ان کے ساتھ تھی۔ ملٹری اور سول بیوروکریسی شامل تھی۔میڈیا اُن کے ساتھ تھا۔جاگیردار، پیر اور پنڈت ان کے ساتھ تھے، بورژوازی انہی کے ساتھ تھی، اور نام نہاد ''مڈل کلاس'' اُن کی اتحادی تھی۔ پیٹی بورژوا دانشور، شاعر اور ادیب انہی کے حاشیہ بردار تھے۔انہی نو (9) قوتوں کو ملا کر جو گروہ بنتا ہے اُس کو ''حکمران طبقات'' کہا جاتا ہے۔ یہ 9 قوتیں ایک دوسرے سے کبھی بھی جدا نہیں ہوتیں۔حکومت خواہ، خمنائی کی ہو، ضیاء الحق کی ہو، یا حامد کرزئی کی۔

اصلی لفظ ''حکمران طبقات'' چونکہ چھوٹ گیا اس لیے لوگوں نے بس ایک فقرے کو پلّو سے باندھا۔ ''بدترین جمہوریت بھی بہترین مارشل لا سے بہتر ہے''۔

یہاں ''حکمران طبقات'' ہی کی نگرانی میں سیاسی پارٹیاں بنوائی گئیں، لیڈر تراشے

گئے اور نعرے ڈھالے گئے۔ رومان بھرے، اور تفکر و صبر سے عاری دانشوروں نے بھی جمپ مارا اور بجائے اپنی پارٹی بنانے کے، لیڈروں کے پیچھے چلنے لگے، موقع پرست دانشور ان نئی نئی بورژوا سیاسی پارٹیوں کے منشور، تقریریں، اور قراردادیں لکھنے لگے۔ اُن کے لیے ترانے گھڑ لیے اور لیڈر صاحب کو پاک پوتر، اصولی، اور انقلابی بنا کر پیش کیا۔

حکمران طبقات نے مینی پولیٹڈ فیوڈل نفسیات کے عین مطابق پارٹی کے بجائے اُس کے لیڈر کو بہت معتبر بنا دیا۔ یوں لیڈر، پارٹی اداروں، اور اُس کے اساسی اصولوں سے بالاتر ہو گیا۔ پارٹی، سیاسی پارٹی کے بجائے جاگیردار کا ڈیرہ بن گئی۔ لیڈر ہی کا فقرہ آئین اور اسی کی بات حتمی ٹھہری۔ اُسی سے وفاداری پارٹی سے وفاداری قرار پائی اور اسی کی خوشنودی عزت و ترقی کا معیار ٹھہری۔

انٹلی جنشیا ذہنی کام کرنے والوں یعنی انجینئروں، ڈاکٹروں، ٹیچروں، ادیبوں اور فن کاروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ لوگ ایک الگ مگر غیر بنیادی تیسرا طبقہ تشکیل دیتے ہیں۔ یعنی بورژوازی اور پرولتاریہ کے بیچ کا طبقہ۔ اسی لیے اسے مڈل کلاس یعنی درمیانہ طبقہ کہا جاتا ہے۔ یہ بنیادی طبقہ اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کی اکثریت حکمران طبقے کی وہ ضروریات پورا کرتی ہے جن کا تعلق ذہنی سرگرمی اور سروسز سے ہوتا ہے۔

یہ اس لیے بھی غیر بنیادی طبقہ ہوتا ہے کہ اس سے کچھ لوگ پرولتاریہ کے ساتھی اور انقلابی بن جاتے ہیں۔ اس انقلابی دانشور کو نچلے کلاس کو انقلابی نظریہ سے لیس کرنا، اسے متحد و منظّم کرنا اور اس کی جدوجہد کو سمت دینا ہوتا ہے۔ اس کی توانائی، علم اور مہارت نچلے کلاس کی نجات پہ مبنی معاشرے کے قیام پہ صرف ہونا ہے۔ اسے مروج بورژوا تصورات سے جان چھڑانے کے لیے مزدور طبقے کی تحریک سے جڑا رہنا ہے۔

گو کہ بہت کم، مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود محنت کش لوگوں کے اندر سے انقلابی دانشور پیدا ہوں۔ ہر دو صورتوں میں روشن فکر دانشور لوگوں کو بورژوا سیاست و معیشت کی

استحصالی نوعیت سے آگاہ رکھنے کا کام کرتا رہتا ہے۔ اور انہیں سماجی انصاف پہ مبنی سماج کے قیام کی جدوجہد میں شامل رہنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ انقلابی دانشور اپنے ممبروں کو بورژوازی کے پھیلائے ہوئے نظریاتی کنفیوژنوں سے ہمہ وقت برسرِ پیکار رکھتا ہے۔

سائنسی سوشلزم کی بنیاد، اس کے اصولوں اور قوانین کی یعنی مزدور طبقے کی آمریت، آہنی ڈسپلن کی حامل کمیونسٹ پارٹی، اور سوشلسٹ تحریک کو تمام موقع پرست اور ترمیم پرست رجحانات سے پاک کرنے کے لیے نظریاتی جدوجہد عوامی دانشور کے اہم فرائض ہوتے ہیں۔

ایک اور سازش یہ کی جاتی ہے کہ غیر ضروری طور پر ''تمام لیفٹ کو متحد'' کرنے کے خوشنما نعرے عام کیے جاتے ہیں۔ ہر اُس فرد کو تنظیم میں شامل نہ کیا جائے جو خود کو سوشلسٹ کہتا ہے۔ ہمہ وقت چوکنا رہنا چاہیے کہ تنظیم میں یا معاشرے میں سوشلزم کی نظریاتی جدوجہد کی راہیں ہموار ہوں۔ سوشلزم دو مخالف سماجی کلاسز کے درمیان جاری کلاس جدوجہد اور اس کلاس جدوجہد میں مزدور کلاس کی نمائندگی کے سیاسی رجحان کا نام ہے۔ مزدور کلاس کی کلاس سٹرگل سے انکار کرنے والے ہر رجحان کی مخالفت کرنی چاہیے۔ کلاس جدوجہد ہوگی تو نظریاتی جدوجہد بھی لازماً ہوگی۔ صرف کپٹلزم کی مخالفت کرنا کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ آپ ورکنگ کلاس کی آمریت کے ذریعے کپٹلزم کو ختم کرنے پر، اس کے لیے آہنی ڈسپلن کی حامل انقلابی پارٹی پر، اور بے لچک، بے خوف نظریاتی جدوجہد پر یقین رکھتے ہوں۔

کلاس سیاست سے وابستہ کارکن اور دانشور کلاس سیاست کے سٹریٹجکل آپریٹر ہوتے ہیں۔ وہ کلاس تضادات کو تیز کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

آج کا دانشور اس لیے کنفیوز اور مایوس ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے ماسوائے اپنی جگہ کے۔ اُسے ہر جگہ تقریر اور مقالہ خوانی کی لت ترک کرنی ہوگی۔ اُس کی یہ دلیل بھونڈی ہے کہ ''ہم نے وہاں اپنی بات رکھنی ہے''۔ اُسے ''مجمعے بازی'' چھوڑنی ہوگی۔ انقلابی دانشور اور سیاسی ورکر کو اپنے کلاس میں، اپنے حلقے میں ہی رہنا ہوگا۔ اُسے اپنی معین جگہ چھوڑنے کا

کوئی حق نہیں۔ نہ اخلاقی اور نہ سیاسی۔

محکوم طبقہ اور قوموں کی پارٹی ورکنگ کلاس کی چیمپین ہے۔ ہر ملک کی ورکنگ کلاس مشکل ترین ورکنگ کلاس ہے۔ ملک کی ورکنگ کلاس کثیر نسلی ہوتی ہے۔ چنانچہ آج مغربی ممالک کے مزدور طبقے میں افریکن ہیں، لاطینی نژاد ہیں، ایشین ہیں، اور گورے ہیں۔ سماجی طور پر دھتکارے ہوئے دیگر لوگوں مثلاً خواتین، نسلی اور مذہبی اقلیتی گروہوں کے لوگ یک جہتی کے لیے اِسی پارٹی کی طرف دیکھتے ہیں۔ اتنی وسیع جمہوری الائنس والی دوسری پارٹی نہ ہوگی۔ بڑا فریضہ ہے آرگنائزڈ لیبر، نسلی وقومی محکوموں، اور عورتوں کے اتحاد کو برقرار رکھنا۔

ایک اور فکری کجروی بھی پھیلائی جاتی ہے۔ مظلوموں کی پارٹی بہت مقامی ہوتے ہوئے بھی مقامی، ملکی یا قومی نہیں ہوتی ہے۔ اس پارٹی کی ایک اہم ڈیوٹی ہے: انٹرنیشنل ورکنگ کلاس کی یکجہتی۔

پارٹی کو اپنے گرد ماس فرنٹس کو یکجا کر کے جلسوں جلوسوں، تقریروں تحریروں، اور الیکشنوں کے ذریعے آگے بڑھتے رہنا ہے۔

ایک اور بڑا فیصلہ یہ کہ مزدور طبقے کی پارٹی ماضی کے تجربات سے سیکھے گی تو سہی مگر وہ ماضی کے کسی ماڈل سے جڑی نہیں ہوگی۔ وہ خود اپنے حالات کے مطابق اپنا ماڈل وضع کرے گی۔

پارٹی کا وژن ہونا چاہیے کہ ایسا معاشرہ ممکن ہے جہاں جیلیں نہ ہوں گی۔ جہاں دیواریں اور سرحدیں انسانوں کو الگ نہیں کریں گی بلکہ یہ انسانوں کے دلوں روحوں کو ملانے والی پُل بنیں گی۔ اسلحہ ہل کے پھل بن جائیں گے۔۔۔ اور کیپٹلسٹ لوگ وہیں جائیں گے جہاں بادشاہ اور ڈائنوسار چلے گئے۔

ماضی اور حال کے سارے اسباق کو سامنے رکھ کر اپنا راستہ بنانا ہوگا۔ مزدور طبقے کی طرف سے سیاسی اقتدار کے حصول کا کوئی ٹیسٹ پیپر اور گٹ تھرو گائیڈ موجود نہیں ہے۔ کوئی

مینوئل موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اُس مستقبل کے نظام کے خاص فیچرز کے لیے بھی کوئی ماڈل موجود نہیں ہے۔ پہلا قدم کب اٹھایا جائے، آئندہ کی رفتار کیا ہو، سماج کو ساتھ کس طرح ملایا جائے، اِن سب کے لیے ریاضی جیسے کلیے اور فارمولے موجود نہیں ہیں۔

ہر مظہر کی داخلی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اُس کے اندر تبدیلی نامی خوشبو نے پھیلنا ہے۔ اگر اس کا ایک راستہ بند کر دیا جائے تو، یہ دوسرے راستے سے پھوٹ پڑتا ہے۔ اگر اس کے سارے روایتی راستے بند کر دیے جائیں تو یہ غیر روایتی راستوں سے کھل اٹھتی ہے۔ اور کبھی کبھی تو ایسے راستوں اور طریقوں سے کہ خود اس تبدیلی کے لیے کام کرنے والے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ اس لیے حالات پختہ ہو جانے پہ کوئی نہیں جانتا کہ کونسی چنگاری کس جگہ سے، اور کب، شعلے بھڑکا دے گی۔

اپنی اپنی تاریخ، روایات اور اپنے عوام کی حالت پر مبنی اپنی راہ تلاش کرنی ہوگی۔

بہت ہنرکاری سے ''آج'' کے کپٹلزم کی بیماری کے علاج کے نسخے کا استعمال ''آج'' کے حالات کے مطابق کرنا ہوگا۔

بلوچستان کے عوام آج بھی پانچ طرح کے جبر سے نجات کی جدوجہد کر رہے ہیں.

1۔ سرداری جاگیرداری نظام کی باقیات کے خلاف

2۔ ابھرتے اور موثر ہوتے ہوئے کپٹلزم کے خلاف

3۔ سامراج کے خلاف

4۔ بلوچستان پہ مسلط قومی جبر کے خلاف

5۔ صنفی جبر کے خلاف۔

اس سب کے متبادل کے بطور ہمارے عوام ماہی گیروں، چرواہوں، سربانوں، کسانوں اور مزدوروں کی اکثریت پر مشتمل جمہوری ریاست چاہتے ہیں۔ جہاں مرد وزن مل کر ایسی حکومت بنائیں جو داخلی جبر واستحصال سے پاک ہو اور خارجی طور پر کسی دوسری قوم

کے جبر سے آزاد ہو۔ ایسا سماج جہاں نہ عقیدے کے نام پہ ظلم ہو، نہ نسل و زبان کی بنیاد پر اور نہ مرد عورت کے امتیاز پر۔ مظلوم طبقات اپنی پارٹی کے پرچم تلے اپنے اتحادیوں کو ساتھ لے کر مخالف قوتوں اور اُن کے اتحادیوں کے خلاف شدید جدوجہد کے بعد ہی فتح مند ہو پائیں گے۔

عوامی بالادستی کی جدوجہد تب ہی کامیاب ہوگی جب دانشور بورژوا سیاسی شعبدہ سے راستے جدا کریں گے۔ سارے تو نہیں مگر کم از کم دانشوروں کے ایک حصے کو تو عوامی نظریہ پر مبنی ایک متبادل سیاسی پارٹی بنانی ہوگی۔ ایسی پارٹی جو ''حکمران طبقات'' سے تعلق نہ رکھتی ہو، بلکہ عوام سے ہو۔ جو محض لیڈروں سے نہ چلتی ہو بلکہ پارٹی کے اندر اداروں اور عوامی آزادی کے نظریہ سے مزین و مستحکم ہو۔ ایسی پارٹی جو ہر اُس پہاڑ سے ٹکرا جائے جو عوامی بالادستی کے سامنے رکاوٹ بنے۔

انیسویں صدی میں جا کر فلاسفرز، بالخصوص کارل مارکس اور اینگلز اس قابل ہوئے کہ تمام یوٹوپیائی فلاسفروں کی دریافتوں کو اکٹھا کریں اور سماج کے مجموعی مطالعے پہ لگ جائیں۔ چنانچہ نظریات کا جو مجموعہ یوٹوپیائی مفکروں کی دریافتوں کو اکٹھا کرنے، ان کی نوک پلک سنوارنے اور انہیں سائنسی صورت دینے سے وجود میں آیا، اُسے مارکسزم کہتے ہیں۔ اس مارکسزم میں سپارٹیکس سے لے کر انیسویں صدی تک کے یوٹوپیائی فلاسفروں کی تعلیمات سموئے ہوئے ہیں۔

مارکسزم نے کچھ عجب دریافتیں کیں۔ ایک یہ، کہ کیپٹلزم میں محنت کا استحصال ہوتا ہے اور چنانچہ سرمائے کا ارتکاز ہوتا ہے۔ یہ بھی کہ کیپٹلزم سماجی ترقی کا حتمی نہیں بلکہ ایک عبوری پڑاؤ ہے۔

پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ آزاد مقابلہ ختم ہوا اور مونا پولیز (اجارہ داریاں) قائم ہوئیں۔ یہی وہ مقام ہے جیسے امپریلزم یا سامراج کہا جاتا ہے۔ منڈیوں پر قبضہ شروع ہوا تھا، اور مقبوضہ منڈیوں کا درندگی کے ساتھ استحصال شروع ہوا تھا۔ اور منڈیوں کی تقسیم پر چھوٹی مقامی جھڑپوں جنگوں سے لے کر عالمی جنگیں ہوئی تھیں۔ سلسلہ جاری ہے۔

یوں یہ کیپٹلزم بلند تر مراحل میں داخل ہو کر اپنا نام، حلیہ اور کرتوت ڈائن کی صورت میں بدل چکا: سامراج یا امپیریلزم۔

اس کا خاتمہ آٹومیٹک نہ ہوگا، اس کے لیے عوام الناس کی شعوری اور انقلابی مداخلت حتمی طور پر ضروری ہے۔

مارکس اور اینگلز نے یہ بھی دریافت کیا کہ استحصال کے بغیر، ایک ''خود حکمراں'' سماج کی طرف جو تبدیلی ہوگی، وہ انقلابی تبدیلی ہوگی، ارتقائی نہیں۔ اور یہ کہ مزدور طبقہ اس انقلاب کی راہنمائی کرے گا۔

مارکسزم نے اپنی دریافتوں پر اکتفا کرنے کے بجائے ہمیشہ اُن کی آبیاری کرتے رہنے کا اصول بھی دریافت کیا۔ اس نے خود کو جامد، ساکن ڈوگما بنائے رکھنے کو مسترد کر دیا۔ مارکسزم زندہ ہی اُس وقت تک رہے گا جب تک کہ نئے نئے تجربات و مظاہر سے اس کی مسلسل وابستگی رہے گی۔ مارکسزم جدید ترین تضادات، اُن کے شیڈز اور پیچیدگیوں کے ساتھ رشتہ استوار رکھتا ہے۔

مارکسزم تھیوری اور پریکٹس کے بیچ باہم عمل کرتے ہوئے، باہم اثر ڈالتے ہوئے زندہ رہتا اور بڑھوتری کرتا ہے۔ مزدور طبقہ کیپٹلزم سے اپنی آزادی کے حصول کے لیے مارکسزم کا ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ اور ایسا وہ اپنے اپنے خصوصی حالات کے مطابق کرتا ہے۔

چنانچہ مارکسزم عقیدہ نہیں ہے۔ یہ رواج نہیں ہے، یہ کوئی آئین بھی نہیں ہے۔ یہ ریڈی میڈ گائیڈ والی کتاب بھی نہیں ہے۔ اسے ایک ملک سے کاپی کر کے دوسرے ملک میں پیسٹ نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ یہ بذاتِ خود ''حقیقت'' بھی نہیں ہے۔ یہ تو ''حقیقت تلاش کرنے کا'' سب سے سائنسی طریقہ ہے۔

جدوجہد کی ان صورتوں کو لے کر چلنے کے لیے پرولتاریہ کو ایک سیاسی پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی سیاسی پارٹی بناتے ہیں۔ جس پر ہم اگلے صفحوں میں بات کریں گے۔

منافع منڈی کا آخری مقدر یہ ہے کہ انقلابی سیاسی پارٹی کے ٹھیک تجزیہ اور ٹھیک

جدوجہد سے بالآخر، بالآخر اُسے ختم کیا جاتا ہے۔کیپٹلزم اپنی انڈسٹری میں، خواہ جتنا بھی ٹکنالوجی استعمال کرے، اُس میں مزدور کی بہر حال ضرورت ہوتی ہے۔اور یہی مزدور اس پورے آفت نظام کو ڈھا سکتا ہے۔مزدور ایسا اپنے آپ کی آزادی کے لیے کرتا ہے۔اس لیے کہ وہ تو انسان تھا، مگر اسے ظلم و نابرابری میں دھکیل کر بھوک، کم اجرت اور افلاس کا جانور بنا دیا گیا۔وہ ناقابلِ بیاں انداز میں اور ناقابلِ بیان حد تک دوبارہ اشرف المخلوق بننے کی آزادی کی خواہش رکھتا ہے۔اور دوبارہ اشرف المخلوقات بننے کے لیے تن من سے لڑتا ہے۔مرجاتا ہے، ناکام ہوتا ہے، برباد ہوتا ہے، شکست کھاتا ہے۔فتح پاتا ہے، مگر لڑنا ترک نہیں کرتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کیپٹلزم خواہ ہر کلومیٹر پہ کارخانے لگائے تب بھی اس نظام میں رہتے ہوئے بے روزگاری ختم نہیں ہوسکتی۔وہ ہر سال بیروزگاری میں اضافہ ہی کرتا رہے گا۔ وہ روبوٹ استعمال کرے گا، دوسری ٹکنالوجی ایسی لائے گا جہاں اسے مزدوری سستی پڑتی ہو۔اس لیے کہ منافع ہی تو پورے کیپٹلزم کی محرک قوت ہوتی ہے۔

ترقی یافتہ کیپٹلزم میں ایک اور معاملہ یہ ہوتا ہے کہ پیداوار کا کردار تو سماجی ہوتا ہے جبکہ ملکیت پرائیویٹ ہوتی ہے۔یہ تضاد ترقی کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

یہ سارے تضادات بحران بن جاتے ہیں اور ہر چار پانچ سال بعد لوٹ کر آتے ہیں۔اور بورژوازی اور پرولتاریہ کے بیچ جنگ شدید تر ہوتی جاتی ہے۔

عالمی سطح پر یا علاقائی اور مقامی سطح پر مارکسزم کے سوا کوئی ایسی فکری تحریک نہیں ہے جس نے نسل انسان کی وحدت، نسل انساں کی ترقی اور خوشحالی کے لیے امن، جمہوریت، برابری اور بنیادی انسانی حقوق و سماجی انصاف کا پرچم بلند کیا ہو یا بامقصد پرمسرت زندگی کی حسین منزل کا راستہ دکھا رہی ہو۔

مارکسزم کی فکری تحریک احترم آدمیت کی تحریک ہے، انسان کی سربلندی کی تحریک

ہے۔عالمی برابری کی تحریک ہے۔تسخیر کائنات کی تحریک ہے۔ایک خوبصورت، حسین اور غیر استحصالی سماج کی تعمیر کی تحریک ہے۔

سوشلزم میں مشین ایک آدمی کی نہیں سرکار کی ہوتی ہے، اور سرکار محنت کش کی ہوتی ہے۔اس لیے مزدور کو محض تین گھنٹے نہیں بلکہ زیادہ گھنٹوں کی اجرت ملتی ہے۔حقیقی گھنٹوں کی حقیقی اجرت کے آس پاس۔

فتح تک لڑائی محنت کش طبقے کی کی مجبوری ہوتی ہے۔ہم نے اُسے ایسا کرتے دیکھا ہے: روس میں، چین میں، ویتنام میں، کیوبا میں۔جہاں اس نے سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کا ''ماتمی ڈھول'' پٹوایا تھا۔اور سماج کی ازسرنو تنظیم کاری کی تھی۔اور ایسا کرتے ہوئے مزدور اِس منافع مارکیٹ کے گلوبل مظہر کے سامنے گلوبل حل ہی پیش کرتا ہے:

دنیا بھر کے مزدورو، اور محکوم قومو! ایک ہو جاؤ۔